بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

مستقبل کا مؤرخ جب اس کرۂ ارض کے گذشتہ چند سالوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالے گا تو اسے اس میں سب سے زیادہ اہم وہ شرمناک اور الم انگیز واقعات کا سلسلہ نظر آئے گا جو بدنام زمانہ گیارہ ستمبر کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ شرمناک اس لئے کہ تہذیب وتمدن کے وہ نظر فریب نقاب جو دورِ حاضر کے انسان نے اپنی ہوسِ خون آشامی اور خوئے درندگی کو چھپانے کے لئے اوڑھ رکھے ہیں ان کی دھجیاں اس بری طرح سے اس سے پہلے شاید ہی کبھی اڑی ہوں۔ ایسے ہی تھے وہ حوادث جن کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے آج سے بہت پہلے لکھا تھا کہ

انساں کہ رخ زغازۂ تہذیب بر فروخت — خاکِ سیاہ خویش چو آئینہ وا نمود
پوشیدہ پنجہ را تہِ دستانۂ حریر — افسونیٔ قلم شد و تیغ از کمر کشود
ایں بو الہوس صنم کدۂ صلح عام ساخت — رقصید گردِ او بنوا ہائے چنگ و عود

دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید
جز یسفک الدماء ونصیم مبیں نبود

مغرب اس سے پہلے اس قدر عریاں ہوکر کبھی میدانِ سیاست میں نہیں آیا تھا۔ مصلحت کوشی۔ نقاب پوشی۔ نرم روی۔ آہستہ خرامی اس کی قومی خصوصیات تھیں۔ اب معلوم ہوگیا کہ وہ اپنی ان قومی روایات سے بھی عاری ہو چکا ہے۔ ان قوموں کا بھرم جتنی جلدی کھل جائے اچھا ہی ہے تاکہ وہ فریب جسے انسانیت نے انکے ہاتھوں کھایا ہے اس کا پردہ چاک ہو جائے اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ محکم بنیادیں کونسی ہیں جن پر انسانی تہذیب وتمدن کی عمارت استوار ہونی چاہئے۔ جس دن انسان نے یہ سوچنا شروع کر دیا وہ زندگی کے صحیح راستے کے بہت قریب آ جائے گا۔ اس لئے کہ تہذیب کی عمارت کے لئے فکرِ انسانی کو قرآن کی متعین کردہ بنیادوں کے علاوہ کوئی اور بنیادیں مل ہی نہیں سکتیں۔ یہ تو اس کا تعصب، جہالت اور غلط نگہی ہے جو یہ ان بنیادوں کی تلاش میں یونہی ادھر ادھر پھر رہا اور تنکوں کے سہارے طوفان تھامنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس دن اس نے اپنے تجربوں کے غلط نتائج کے بعد، خالی الذہن ہوکر سوچنا شروع کر دیا زندگی کا صحیح راستہ اس کے سامنے آ جائے گا۔

اور یہ سلسلۂ سانحات الم انگیز اس لئے ہے کہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے تمام مسلمان بیک لمحہ تلملا اٹھے ہیں لیکن یہ ظالم کا ہاتھ روکنے کے لئے جلسے اور جلوس، ریزولیوشن اور دعاؤں سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ صورت حالات مسلمانانِ عالم کو اپنی حالت پر غور کرنے پر آمادہ کر دے تو اس کی یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں ہوگی۔ ذرا سوچئے کہ اگر مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے علاقہ میں پھیلی ہوئی یہ قوم، کہیں امت واحدہ بن جائے تو ان کی قوت کیا سے کیا نہ کر دے؟ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں عرب نسل پرستی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ اس سے پیچھے ہٹئے تو انہیں وطنیت (Nationalism) کی چار دیواریاں ٹکڑے ٹکڑے کئے ہوئے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی مفاد پرستیاں انہیں ایک دوسرے کا حریف بنائے ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ آپس میں تو لڑتے اور غیر مسلموں سے اپنے رشتے جوڑتے ہیں۔ ادھر پاکستان سے یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ ہمیں ''پان اسلامزم'' کے بجائے ''پاک اسلامزم'' کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے (سب سے پہلے پاکستان)۔ کوئی یورپ کی طرف دیکھ رہا ہے اور کوئی اپنا رخ امریکہ کی طرف کئے ہوئے ہے۔ اور یہ تشتت وانتشار کا عالم اس قوم کا ہے جس کا ایمان ہے کہ **انما المومنون اخوۃ** (۴۹/۱۰)۔ سوچئے کہ اگر ان الفاظ کو ثواب کی خاطر دہرانے کے بجائے اس قوم کا اس پر فی الواقعہ ایمان ہو جائے تو آج کس طرح دنیا کا نقشہ بدل جائے!

لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ہر چند مسلم ممالک کا باہمی اتحاد (بلکہ اخوت) بہت بڑی چیز ہے لیکن صرف اسی کو کافی سمجھ لینا بھی غلطی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تمام دنیا کے مسلمان ایک طرف ہو جائیں اور مغرب کی طاقتیں ان کے مقابلہ میں دوسری طرف، تو یہ سب مل کر بھی مغربی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے (یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج، باہمی اتحاد کے بجائے مغربی طاقتوں کے سہاروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں)۔ اقوام مغرب کی یہ قوت سائنس کی ترقی کی بدولت ہے جس پر قرآن نے اس قدر زور دیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے ساتھ کرنے کا کام یہ ہے کہ یہ متحدہ کوششوں سے تسخیر فطرت کے لئے مسلسل جدوجہد کریں۔ اس کے بعد یہ دیکھیں کہ کس طرح دنیا کی امامت ان کے حصے میں آتی ہے اور جب یہ فطرت کی قوتوں کا استعمال قرآنی نظام کے مطابق کریں، تو پھر ساری دنیا دیکھے گی کہ یہ زمین کس طرح اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔ **فھل من مدکر؟**

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی الارض (ابو ہریرہؓ)

قرآن کریم میں الارض کے متعلق ہے کہ اس میں تمہارے لئے سامان زندگی پیدا کیا (۱۰/۷۔۲۰/۱۵) لہٰذا ہمارے دور میں جن چیزوں کو وسائل پیداوار (Means of Production) کہتے ہیں وہ سب ارض کے اندر آ جاتی ہیں۔ اس لئے زمین اور اس کے سرچشموں (یعنی زمینی پیداوار) کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں کھلا رہنا چاہئے (۱۰/۴۱)۔ اس کے برعکس پاکستان کے وزیراعظم محترم میر ظفر اللہ خان جمالی صاحب نے (جماعت اسلامی کے بانی محترم مولانا مودودی مرحوم کے اتباع میں) اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے ہی پہلا اعلان یہ کیا کہ ہم زرعی اصلاحات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ بھارتی حکومت نے تقسیم ہند کے فوراً بعد اپنے ہاں زرعی اصلاحات کر کے ہندو قوم کو معاشی پریشانی سے نجات دلا دی۔ قرآن کریم کی رو سے وسائل پیداوار اور سامان زیست (مثلاً روشنی، ہوا، پانی اور زمین) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ یہ وہ انقلاب ہے جسے قرآن چھٹی صدی عیسوی میں اس وقت لایا جب دنیا جاگیرداری اور زمینداری کو عین ''مطابق فطرت'' سمجھے ہوئے تھی۔ دنیا نے اس وقت اس انقلاب کی اہمیت کو نہ سمجھا (اور بعد میں خود مسلمانوں نے بھی اسے پس پشت ڈال دیا) لیکن اب وہی دنیا زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس کی طرف کشاں کشاں چلی آ رہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ کیا یہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں (۱۳/۴۱)۔ اس طرح بتدریج وہ وقت آ جائے گا جب زمین کسی فرد کے ہاتھ میں نہیں رہے گی بلکہ تمام افراد انسانیہ کی پرورش کا ذریعہ بن جائے گی۔ یہ وہ دور ہوگا جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی (۶۹/۳۹)۔ صحیح بخاری جلد ۴ حدیث نمبر ۳۹۲۔ اور جلد ۹ حدیث نمبر ۷۷ میں ابو ہریرہؓ سے روایات ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ زمین (سرزمین عرب) اللہ اور اس کے رسول (نظام خداوندی۔ اسلامی مملکت) کی ملکیت ہے۔ (مومنین نے تہہ دل سے نظام خداوندی کی اطاعت کرتے ہوئے اپنی زمینیں اس کی ملکیت میں دے دی ہیں تم چونکہ اسلامی سوسائٹی کے ممبر نہیں اس لئے) تم اپنی زمینیں فروخت کر سکتے ہو۔ چونکہ یہود اپنی خصلت کی بنا پر تخریب کاریوں سے باز نہیں آتے تھے اس لئے بعد میں انہیں مدینہ منورہ سے نکال

دیا گیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے قرآن کریم میں جہاں بھی اللہ اور رسول ﷺ کی یکجا اصطلاح آئی ہے وہاں اس سے مراد نظام خداوندی (قرآنی حکومت/اسلامی حکومت) ہے۔ جس کی تائید مندرجہ بالا حدیث سے ہو جاتی ہے۔ خلفائے راشدینؓ کے بعد ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے گٹھ جوڑ سے اللہ اور رسولؐ کی ایک اطاعت کو دو الگ الگ اطاعتیں قرار دے کر مسلمانوں کو دین کی پٹڑی سے اتار کر خود ساختہ مذہب کی پامال پٹڑی پر ڈال دیا گیا۔ ہم عقیدت کے مارے مسلمان انہی فرسودہ راہوں پر چلتے آ رہے ہیں۔ اللہ اور رسولؐ کی دو الگ الگ اطاعتوں کے لئے نظام کی ضرورت ہی نہیں اس لئے قرآنی نظام کا تصور ہم مسلمانوں کے اذہان سے محو (Erase) کر دیا گیا۔ اگر حضور ﷺ کا متشکل کردہ نظام حکومت جاری رہتا تو کبھی بھی مسلم قوم پر زوال نہ آتا اور زمین

اسلامی حکومت کی ملکیت ہوتی تو قیامت تک اسرائیل وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔ مستقبل میں سعودی عرب میں اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے یہ مدینہ تک بھی جا سکتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں قرآنی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے انڈیا بغیر جنگ کئے فلم انڈسٹری۔ میڈیا پروپیگنڈہ۔ تجارت۔ ریلوے اور بس سروس۔ وفود کے میل ملاپ۔ کشمیر کے متعلق مذاکرات کے وعدے جو وہ کبھی پورے نہیں کرے گا' سے آہستہ آہستہ بتدریج اپنے اکھنڈ بھارت کے مقصد میں کامیاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انہوں نے مقبوضہ کشمیر میں ریلوے لائن بھی بچھا لی ہے اور باڑ بھی لگا لی اور تو اور ہماری وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال کو بھارت کا دورہ کروا کر پاکستانی مسلم بچوں کو چھینک آنے پر الحمدللہ کی بجائے جے نندی کہنے کے لئے نصاب تعلیم ہی بدلوا ڈالا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد اسلام علوی

سُپر پاور کون؟

خاندان برامکہ کے عروج و زوال سے کون اہل علم ناواقف ہوگا۔ یحیٰ برمکی، خالد برمکی، فضل برمکی اور جعفر برمکی سب کے سب باپ بیٹے وزیر ہوئے۔ کوئی وزیر کبیر کہلاتا تھا اور کوئی وزیر صغیر۔ ایک وقت تو عملاً وہی حکمران تھے۔ خلیفۃ المسلمین ان کے ہاتھوں میں گویا ایک مہرے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اسی دور کی بات ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید اور اس کا برمکی وزیر ایک شاہی باغ کی سیر کر رہے تھے ایک درخت کی شاخ کے سرے پر ایک بہت ہی پکا ہوا رس بھرا سرخ سیب دیکھنے والے کی اشتہاء کو انگیخت کر رہا تھا۔ خلیفہ نے سیب توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر پہنچ نہ سکا۔ ایڑیاں اونچی کرنے سے بھی کام نہ بنا۔ وزیر صاحب کو کہا کہ میں بیٹھتا ہوں آپ میرے کندھے پر کھڑے ہو کر یہ سیب توڑیں۔ چنانچہ وزیر نے سیب توڑا اور خلیفہ نے تناول فرمایا۔ باغ کا انتظام اور دیکھ بھال خلیفہ کو پسند آئی۔ باغ کے مہتمم کو حسن کارکردگی کی سند دینے لگے تو اس نے عرض کی کہ حضور اس میں یہ بھی لکھ دیں کہ اس مہتمم کا برمکی خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔ وجہ پوچھنے پر اس نے کہا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے شاہی باغ کا مہتمم اس لئے لگایا گیا ہے کہ میرا برمکی خاندان سے تعلق ہوگا۔ جبکہ میں ایک معمولی آدمی ہوں اور اس عظیم خاندان سے میری نسبت ان کی عزت و وقار کے منافی ہے۔

اس کی درخواست منظور کر لی گئی اور سند پر خلیفہ اور وزیر کے مہر و دستخط ثبت ہو گئے۔ پھر حالات نے جو پلٹا کھایا تو راتوں رات برمکی خاندان کی گردنیں قلم کر دی گئیں۔ ہر ادارے اور محکمے پر ان کے حامیوں اور ان کی لابی کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ اس شاہی باغ کا مہتمم بھی زد میں آ گیا۔ اس نے اپنی صفائی میں خلیفہ کی دستخط شدہ سند پیش کی۔ اس سے سند کے حصول کی وجہ پوچھی گئی۔ کیونکہ اس پر درج تاریخ کے وقت برمکی خاندان کا سورج نصف النہار پر تھا اور پورے ملک میں برامکہ کا طوطی بولتا تھا۔ جہاندیدہ بوڑھے نے وہ سیب والا واقعہ بیان کر کے بتایا کہ جب وزیر صاحب خلیفۃ المسلمین کے کندھے پر چڑھے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ بس اب اس سے آگے مزید کوئی گنجائش نہیں۔ اس سے آگے کھائی ہے۔ اب الٹا پہیہ گھومنے کا آغاز ہونے والا ہے۔ وزیر با تدبیر یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ یا امیر المومنین میں بیٹھتا ہوں آپ میرے کندھے پر کھڑے ہو کر سیب توڑ لیں۔ امت مسلمہ کے عظمت و وقار کی علامت خلیفہ کو اس طرح سیڑھی بنانے کے عمل سے میں ڈر گیا چنانچہ آج میری پیش بینی اور خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ آج اہل برامکہ پر زمین تنگ ہو گئی ہے۔ اور ان کے تمام متوسلین بھی زد میں آ گئے ہیں۔ بہرحال میرا اس خاندان سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔

قارئین کرام ہر کمال کو زوال اور بلندی کے بعد پستی قانون فطرت ہے۔ چاند جب بڑھتے بڑھتے مکمل ہو جاتا ہے تو گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ بیج تیار ہو کر ایک بالی کی شکل میں زمین سے نکلتا ہے پھر پودے سے درخت بن کر آسمانسے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جھکڑ' آندھی' سیلاب کا مقابلہ کرتا ہے۔ پوری پوری بارات اس کے نیچے دھوپ اور بارش سے پناہ لینے بیٹھ جاتی ہے۔ آخر **کل من علیھا فان** (۲۶/۵۵) کے حکم ربانی کے تحت چورا چورا اور بھسم ہو جاتا ہے۔ سدا رہے نام اللہ کا باقی رہے نہ کو۔ امریکہ جو اپنی زبان حال سے **انا ربکم الاعلیٰ** (۲۴/۷۹)۔ کا فرعونی نعرہ لگا رہا ہے' دنیا کو **لمن الملک الیوم** (۱۶/۴۰) کا چیلنج دے رہا ہے۔ تقدیر اس کی اداؤں پر خندہ زن ہے۔ جو حیثیت آج خطۂ ارضی پر امریکہ کی ہے اس سے پہلے بھی ''ہمچو ما دیگرے نیست'' کا دعویٰ کرنے والے ایسے ایسے ہو گذرے ہیں جن کے حق میں خود قرآن نے ''**لم یخلق مثلھا فی البلاد** (۸۹/۸)'' کی گواہی دی ہے۔ وہ اپنے وقت کے لحاظ سے امریکہ سے بھی بڑھ کر تھے۔ لیکن آج ان کا نام ونشان بھی ناپید ہے۔ ؎

بوم نوبت می زند برگنبد افراسیاب

اپنے وقت کی سپر پاور قیصر روم کے محلات میں آج مکڑیوں نے جالے تان کر پردے لٹکائے ہوئے ہیں اور شاہ افراسیاب کے محلات پر آج اُلو بول رہے ہیں۔

قارئین کرام! دعویٰ احدیت وصمدیت صرف اسی کو زیبا ہے جو خالق کائنات ہے۔ ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اگر کوئی اور الواحد القہار اور احد وصمد کا مصداق بننے کا خواہاں ہو تو اس کے بھیانک انجام کے تصور سے ہی ہول آنے لگتا ہے۔ ہمارا ایمان ہی نہیں بلکہ ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جب نمرودیت وفرعونیت اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو کسی خلیل وکلیم کی آمد یقینی ہو جاتی ہے۔ اللہ کے قانون امہال کے تحت دیئے گئے وقفۂ مہلت کے ختم ہونے پر ہر فرعون کے لئے کوئی موسیٰ بھیج دیا جاتا ہے۔ راقم کا علم الیقین اس معاملے میں عین الیقین سے بھی آگے حق الیقین کے درجے کو پہنچا ہوا ہے گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کے نمرود وفرعون کے لئے آج کا خلیل وکلیم آنے والا ہے۔ ہوسکتا ہے فی الحال وہ کہیں شکم مادر میں پرورش پا رہا ہو' یا کہیں پنگھوڑے میں ہمک رہا ہو یا کہیں ماں کی گود میں کھیل رہا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ یہ ساری منزلیں طے کر چکا ہو اور نمرود زماں اور فرعون دوراں کے بالکل قریب' اس کے گھر کے اندر یا اس کے کہیں دائیں بائیں اس کے طریقہ ہائے واردات کو سمجھنے اور اس کی حکمت عملیوں سے آگاہی حاصل کرنے میں لگا ہوا ہو۔ آج پورا جہاں ایک بت خانہ بنا ہوا ہے اور اس میں صرف ایک ہی بت سجا ہوا ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کا ابراہیمی کلہاڑا کب حرکت میں آتا ہے۔ سامری کا بچھڑا بھاں بھاں کر رہا ہے' ضرب کلیمی کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

عوام الناس چشم براہ اور حیران وپریشان ہیں کہ آج کے آذروں کے گھر ابراہیم جنم کیوں نہیں لیتے' جن سے امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ بسا اوقات وہ خود نمرود بننے کے متمنی اور فرعون بننے کے لئے کوشاں ہو جاتے ہیں۔ آج کی مجبور' بے کس و بے بس ماؤں کے

پھینکے ہوئے بچوں کو کسی فرعون کی کوئی آسیہ پال پوس کر کلیم کیوں نہیں بنا دیتی۔ آج ہماری جامعات کے شعبہ حیوانیات میں مچھروں کی ایسی نسل تیار کیوں نہیں کی جاتی جو دورِ حاضرہ کے نمرودوں کی ناکوں میں گھس کر ان کے دماغوں کی اصلاح کریں' پھر باہر سے تو ان کے اپنے چہیتے درباریوں کے جوتے ان کا علاج کرنے لگ جایا کرتے ہیں۔ امید واثق ہے آج کے کسی آذر کے گھر سے ضرور کوئی ابراہیم اٹھے گا۔ مجبور و بے بس ماؤں کے پھینکے ہوئے کسی بچے کو کسی فرعون کی کوئی آسیہ پال پوس کر کلیم بنا دے گی پھر ید بیضا و ضرب کلیمی کے معجزے نمودار ہوں گے۔ ہماری جامعات ایسے مچھروں کی ایک کھیپ تیار کریں گی جو عہد حاضر کے نمارہ کی ناکوں میں گھس کر اندر سے ان کے دماغوں کی اصلاح کریں گے اور پھر باہر سے ان کے انہیں درباریوں' حامیوں' اتحادیوں اور ''قدم بڑھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں'' کے نعرے لگانے والوں کے جوتے انکا علاج کر دیں گے۔ انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔ **وکان الانسان عجولا** ۱۱/۱۸' لیکن اللہ تعالیٰ کو اتنی جلدی نہیں۔ اس کا اپنا منصوبہ' اپنا پروگرام اور اس کے لئے اپنا ایک نظام الاوقات ہوتا ہے۔ اس کا تو ایک ایک دن ہمارے ہزار ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ **وان یوما عند ربک کالف سنة مما تعدون** ۲۲/۴۷' **یومٍ کان مقداره الف سنة مما تعدون** ۳۲/۵' **یوم کان مقداره خمسین الف سنة** ۷۰/۴' پہلی دو آیتوں میں ہزار ہزار سال کے دن اور تیسری آیت میں پچاس ہزار سال کے دن کی بات کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی تو ابتدائے کار ہے۔ چند منٹوں کی بات ہے۔ ذرا انتظار تو کیجئے معلوم ہو جائے گا سپر پاور کون ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید امتیاز احمد

پھول جو میں نے چُنے

(''نظام ربوبیت'' سے ماخوذ)

سلسلۂ کائنات کی تمام ہنگامہ آرائیاں' اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتوں کو مشہود کرنے کے لئے ہیں۔

☆☆☆

انقلاب' قلب کی گہرائیوں سے ابھرنے والے مقاصد کے مظاہرہ کا نام ہے نہ کہ محض خارج میں فساد برپا کر دینے کا۔

☆☆☆

قوموں کی ہلاکت و بربادی کی یہی شکل نہیں ہوتی کہ وہ قوم طبعی طور پر فنا کر دی جائے اور صفحہ ارض پر اس کا کوئی ایک فرد بھی باقی نہ رہے۔ تباہی کی بدترین شکل یہ ہے کہ وہ قوم طبعی طور پر تو زندہ رہے لیکن اس کا شمار مردہ قوموں میں ہو۔

☆☆☆

نفسِ انسانی کی تربیت کا راز دینے میں ہے۔ یعنی اس میں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کس حد تک نوع انسانی کی عالمگیر ربوبیت اور حسنِ کائنات میں اضافہ کے لئے وقف کرتا ہے۔

☆☆☆

یہ تو تمہارے اختیار میں ہے کہ تم کس قسم کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ تم زندگی ایک نہج کی بسر کرو اور اس کے نتائج دوسری قسم کے برآمد ہو جائیں۔

☆☆☆

اس کائنات میں ایک ہی قانون ہے جو انفس اور آفاق کی دنیا میں کارفرما ہے یعنی وہی قانون ربوبیت جو خارجی کائنات میں ازخود نافذ العمل ہے اسے انسانی دنیا میں بھی نافذ العمل ہونا چاہئے۔

☆☆☆

مفاد خویش کے نظریہ کے ماتحت دنیاوی زیست کا سامان لہو ولعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ حقیقی زندگی اسی نظریے سے حاصل ہو سکتی ہے جس میں نگاہ مستقبل اور پوری انسانیت پر رہے۔

☆☆☆

انسانوں کی دنیا میں اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس سے خالص ابلیسی معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے.....لیکن اگر اسی عقل کو وحی کے تابع رکھا جائے تو جنتی معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے۔

☆☆☆

جب معاشرہ میں ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بغیر حقوق کے تقاضے بلند ہونے شروع ہو جائیں تو اس کا نتیجہ انتشار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

☆☆☆

جو قوم اپنے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتی ہے خود ان کی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور چونکہ زندگی کا دارومدار توازن اور اعتدال پر ہے۔ اس لئے اس عدم توازن سے ان کی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد ایوب، لاہور

حدود آرڈیننس اصلاح طلب ہے

مکرمی! جب جنرل ضیاء الحق نے چوری، ڈاکے، زنا، قذف وغیرہ پر آرڈیننس جاری کیا تو حسب معمول کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا کیونکہ اس کو لکھنے والوں میں تین جسٹس، دو وکیل اور پانچ علماء تھے البتہ میں نے تبصرہ کیا تھا۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ ان جرائم کی شہادت کے لئے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ شاہد دو بالغ متقی مسلمان مرد ہوں۔ میں نے لکھا کہ یہ محال ہے اس لئے کسی کو سزا نہ ہوگی چنانچہ کسی کو سزا نہیں ہوئی اور ڈاکے اور چوریاں کھلے عام ہو رہی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ایک چور کو جج نے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی لیکن شریعت کورٹ کے جج تقی عثمانی نے اس بناء پر منسوخ کر دی کہ گواہ متقی نہیں ہیں۔ میں نے ان کو لکھا کہ آپ کے نزدیک جس آدمی کی داڑھی نہ ہو وہ متقی نہیں ہوتا۔ پھر سزا کیسے ہوگی اور جرم کیسے رکیں گے؟

اب عورتوں نے حدود آرڈیننس کی تنسیخ کا مطالبہ کیا ہے اس پر میں نے جرم زنا کے متعلق اس حکمنامے کا مطالعہ کیا اور مضمون اخبارات کو بھیجا مگر کسی نے شائع نہیں کیا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے:

(1) زنا کو قرآن نے جرم قرار دیا ہے اس لئے حکم منسوخ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی اصلاح کرنی چاہئے۔

(2) فقہ میں قرآنی سزا کو حد یعنی انتہائی سزا کہا گیا ہے لیکن کم تر سزا کا موقع بھی آ سکتا ہے اسے تعزیر کہا گیا ہے۔

(3) قرآن نے زانی کو لوگوں کے سامنے سو کوڑے مارنے کا حکم دیا ہے بشرطیکہ چار آدمی اس کی گواہی دیں اگر گواہ کم ہوں تو خاموشی کا حکم ہے۔ کوئی بولے تو اَسی کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ کوڑوں سے کوئی جسمانی گزند نہیں پہنچتا۔ مقصد مجرم کو ذلیل کرنا اور جرم کو عام ہونے سے روکنا ہوتا ہے۔ نسل انسانی کا بقا اس فعل پر منحصر ہے اس لئے اس فعل کی شدید خواہش وجود میں رکھی گئی ہے لہٰذا بہتوں کے چوک جانے کا ہر وقت خطرہ ہوتا ہے اسلام کا منشا جیسا کہ حدیث سے بھی واضح ہوتا ہے یہ نظر آتا ہے اللہ جس گناہ پر پردہ ڈال دے مجرم اور لوگ اس پر خاموش رہیں۔

(4) آرڈیننس میں بالغ مرد کی عمر 18 برس اور بالغ عورت کی عمر 16 برس رکھی گئی ہے جو درست نہیں۔ جو شخص اس فعل پر قادر ہے وہ بالغ ہے۔

(5) تعزیر میں قید، جرمانہ اور رجم رکھے گئے ہیں رجم کے معنی سنگسار کرنا یعنی پتھر مار کر ہلاک کرنا ہے یہ انتہائی سخت اور وحشیانہ سزا ہے اسے تعزیر نہیں کہا جا سکتا۔ شادی شدہ زانی کے

لئے یہی سزا کہی گئی ہے اور امت اس پر عمل بھی کرتی رہی ہے اور رسول اللہ صلعم نے بھی اس کا حکم دیا ہے لیکن بعض نے کہا ہے آپؐ نے یہ سزا سورہ نور میں کوڑوں کی سزا سے پہلے دی ہے کیونکہ آپ ایسی حالت میں توریت پر عمل کرتے تھے بہرحال ہماری رائے میں قرآن کے واضح حکم کے بعد اس کا کوئی جواز نہیں۔

(6) آرڈیننس میں زنا بالجبر کے لئے چار گواہوں کو لازم کیا گیا ہے حالانکہ اس جرم کے وقت گواہ نہیں ہوتا اس کا ثبوت اور باتوں میں تلاش کیا جائے گا لیکن اس جرم سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ ظلم ہے۔ ایسے مجرم کو کوڑوں کے علاوہ قید کی سزا بھی دی جائے گی اور آج کل جو گینگ ریپ چل پڑے ہیں وہ فساد فی الارض ہے اور ان کی سزا موت ہے اور عدالت کو فوری طور پر جائے وقوعہ پر پہنچ کر مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہئے۔

(7) کنواری حاملہ عورت کا جرم ثابت ہوتا ہے ایسی عورتوں کو اب بچے سمیت قید میں ڈال دیا جاتا ہے مگر اس عورت کی سزا صرف ایک سو کوڑے ہے جو وضع حمل کے چالیس دن بعد لگائے جائیں متعلقہ مرد کے انکار پر واقعاتی اور علمی ثبوت تلاش کیا جائے۔

(۸) الغرض آرڈیننس میں (الف) بلوغت کی عمر درست کی جائے (ب) رجم کی سزا منسوخ کی جائے۔ (ج) شادی شدہ زانی کی سزا بھی سو کوڑے ہوگی (د) کنواری حاملہ عورت کو بھی صرف سو کوڑے مارے جائیں (ر) متعلقہ مرد کے خلاف ثبوت تلاش کیا جائے (و) زنا بالجبر کے مجرم کو کوڑوں کے علاوہ سات سال قید کی سزا بھی دی جائے (ز) گینگ ریپ کے مجرموں کو موت کی سزا دی جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عطاء الحق قاسمی

ٹیکسٹ بک بورڈ کے جزوی دفاع میں

میں نے اپنے ایک گزشتہ کالم میں لکھا تھا کہ مغربی ملکوں کی امداد سے چلنے والی ایک این جی او نے ہماری نصابی کتابوں کے حوالے سے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ قومی اور ملی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں ہیں تاہم 2004ء میں منصۂ شہود پر آنے والی کتابوں کے حوالے سے جو احتجاج دیکھنے اور سننے میں آ رہا ہے میں اس پر کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کیونکہ میں نے یہ کتابیں نہیں دیکھیں اور احتیاط اور صحافتی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ سنی سنائی باتوں پر اندھا دھند یقین نہ کیا جائے۔

ان کتابوں میں سے ایک کتاب ''بہار اردو'' بھی ہے جو جماعت دہم کے طلبہ و طالبات کے لئے ہے۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی کی مشہور زمانہ کتاب ''الفاروق'' میں سے ایک اقتباس پر احتجاج کیا جا رہا ہے جس میں درج ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے کچھ مواقع پر بعض دوسرے صحابیوںؓ کی موجودگی میں رات بھر بعض صحابیوں یا تابعین سے گانا سنا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ یہ کتاب منگوا کر دیکھی جائے چنانچہ میں نے اردو بازار سے یہ کتاب خریدی اس میں یہ روایت ممتاز محدث ابن الجوزی کی کتاب ''سیرت العمرین'' کے حوالے سے درج ہے۔

آپ یقین کریں میں نے سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی کہ اعتراض اور احتجاج کس بات پر کیا جا رہا ہے؟ سارے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اچھی آواز میں گانا سننا جائز ہے۔ اس کے علاوہ کچھ علماء ساز کے ساتھ عارفانہ کلام سننے کے حق میں بھی ہیں اور کچھ علماء ہر قسم کی موسیقی اور کلام کو جائز قرار دیتے ہیں بشرطیکہ وہ شہوانی جذبات کو بھڑکانے والی نہ ہو۔ مولانا جعفر شاہ پھلواری کی کتاب ''اسلام اور موسیقی'' میں تو ایسی بے شمار روایات پیش کی گئی ہیں جن سے ان کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے لیکن حضرت عمر فاروقؓ جو گانا سنتے رہے اس پر تو علماء کے سبھی حلقے متفق ہیں کہ اس میں تو سازوں کے استعمال کا سرے سے کوئی ذکر نہیں۔ خوبصورت ترنم کے ساتھ اشعار پڑھنے والے صحابیؓ اسے سن کر محظوظ ہونے والے صحابی اور اس پر اعتراض کرنے والے ہم ایسے گنہگار مسلمان! ایں چہ بوالعجبی ست؟ صرف یہی نہیں بلکہ یہ روایت بیان کرنے والے بلند مرتبہ محدث ابن الجوزیؒ ہیں جن کی تائید شاہ ولیؒ اللہ بھی کرتے ہیں۔ اسے اپنی کتاب میں درج کرنے والے علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں اور کتاب ''الفاروق'' ہے جو حضرت عمر فاروقؓ پر مستند ترین سوانحی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں سے یہ اقتباس ''بہار اردو'' میں درج کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں احتجاج کی لہر ابھر آتی ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی یہ احتجاج کس کے خلاف ہے؟ ''بہار اردو''

میں درج مضمون میں حضرت عمرؓ کے حوالے سے صرف متذکرہ روایت ہی بیان نہیں کی گئی بلکہ ان کی سیرت کے ایسے روشن پہلو نمایاں کئے گئے ہیں جو طلبہ و طالبات کے دلوں میں ان کی عظمت کا گہرا نقش ثبت کرتے ہیں۔ خوبصورت ترنم میں اشعار سننے کی روایت بھی ان کے حسن ذوق کی آئینہ دار ہے۔ میرے خیال میں یہ مضمون اگر نصاب میں سے خارج کیا جاتا ہے تو یہ طلبہ و طالبات کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ دراصل ہمارے ہاں اسلام کا ایک مخصوص تصور ذہنوں میں راسخ کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ اسے ''عجمی اسلام'' کا نام دیتے ہیں چنانچہ اس ''عجمی اسلام'' سے ذرا سی بھی پرے ہٹی ہوئی بات ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس ''عجمی اسلام'' میں تفریح کا کوئی تصور نہیں ہے۔ فنون لطیفہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں کوڑے ہی کوڑے ہیں اور ظاہر ہے یہ تصور اصل اسلام کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ مغربی ملکوں کے تنخواہ دار دانشوروں کی سفارشات ایک انتہا پر ہیں اور ایک اچھی نصابی کتاب پر ہمارے اعتراضات ایک دوسری انتہا کی خبر دیتے ہیں حالانکہ اردو کی اس کتاب کے مضامین میں ماضی میں شائع ہونے والی نصابی کتاب سے کہیں زیادہ اسلامی روح موجود ہے۔ اور حیرت ہے کہ یہ کام موجودہ حکومت کے دور میں ہوا ہے۔

البتہ متذکرہ بالا درسی کتاب کے آغاز میں صدر مملکت جنرل پرویز مشرف اور وزیراعلیٰ پنجاب کے تفصیلی پیغامات ہیں۔ ایک چھوٹے سے کونے میں قائداعظمؒ کا فرمودہ بھی درج کیا گیا ہے۔ چنانچہ کچھ صحیح اندازہ نہیں کہ پاکستان دراصل کس نے بنایا تھا؟ حاکم آتے جاتے رہتے ہیں۔ قائد باقی رہتے ہیں۔ کل کلاں جنرل پرویز مشرف اور چودھری پرویز الٰہی کی جگہ کوئی اور لوگ آ جائیں گے تو پھر آپ کیا کریں گے۔ یہ کتابیں تلف کر دیں گے؟ بہرحال میری ذاتی دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ' اس کی چیئرپرسن' کتاب کے مرتبین اور پنجاب حکومت کو ''بہار اردو'' کی اشاعت کے حوالے سے مطعون نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی وفاقی وزارت تعلیم کو اس کتاب کی اشاعت پر شرمندہ ہونے اور معذرت خواہانہ رویہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ البتہ باقی کتابوں کے بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ میری نظر سے نہیں گزریں۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور' بدھ' 21 اپریل 2004ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملک احمد سرور

تربیت کی اہمیت وضرورت

تربیت کا مفہوم

لغت میں تربیت کے معنی پرورش، پرداخت، تعلیم و تہذیب اور تعلیم و اخلاق کے ہیں۔ قرآن مجید میں تربیت کے لئے ''تزکیہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لغت میں تزکیہ کا ایک مطلب پاکیزگی و صفائی اور دوسرا نشوونما اور پرورش ہے۔ اگانا، بڑھانا اور سنوارنا بھی اس کے معنی ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے سورہ البقرہ کی آیت ۱۲۹ میں ''**یزکیھم**'' کی تفسیر میں لکھا ہے: ''زندگی سنوارنے میں خیالات، اخلاق، عادات، معاشرت، تمدن، سیاست غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے''۔ سید قطب شہید کے نزدیک **یزکیھم** کا مطلب ہے: ''دل کو شرک کی آلائش، جاہلیت کی آلودگی، شہوانی قوت کی گندگی، غرض تمام گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک کرنا''۔ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم اپنی تفسیر تدبر قرآن میں لکھتے ہیں: ''لفظ تزکیہ دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک پاک و صاف کرنے پر، دوسرے نشوونما دینے پر، ہمارے نزدیک یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ جو چیز مخالف و مزاحم زواید و مفاسد سے پاک ہوگی، وہ لازماً اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان بھی چڑھے گی۔ انبیاء علیہم السلام نفوس انسانی کا جو تزکیہ کرتے ہیں، اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک صاف بھی کرتے ہیں اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشوونما دے کر ان میں مفاسد اور مخالف و مزاحم چیزوں کے بالمقابل استقلال کے ساتھ سینہ سپر رہنے اور استقامت دکھانے کی قوت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کتاب کے مقابلہ میں نفوس کا تزکیہ کہیں زیادہ دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و ریاض کا طالب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کا ذکر تمام دین و شریعت کے غایت و مقصد کی حیثیت سے ہوا ہے''۔

وہ مزید لکھتے ہیں: ''تزکیہ کا عمل تعلیم سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور وسیع الاطراف ہے۔ یہ بہ یک وقت علمی بھی ہے اور عملی بھی، ظاہری بھی ہے باطنی بھی، مادی اور جسمانی بھی ہے اور عقلی و روحانی بھی، نیز یہ انفرادی بھی ہے اور سماجی اور اجتماعی بھی۔ اس کا ایک تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے اذہان، اعمال اور اخلاق پر خوردبینی نگاہ ڈال کر ان جراثیم سے ان کو پاک کیا جائے جو روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا سبب بنتے ہیں اور ساتھ

ہی ان نیکیوں کی تخم ریزی کی جائے جو انسان کے ظاہر و باطن کو سنوارتی اور اس کے عادات و خصائل کو مہذب بناتی ہیں۔ اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ہر خوبی ان کے اندر جڑ پکڑ جائے اور ہر برائی کے خلاف طبیعتوں میں نفرت بیٹھ جائے۔ اس کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس تعلیم و تربیت سے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جو تزکیۂ نفوس کے لئے ایک وسیع تربیت گاہ کا کام دینے لگ جائے' جو شخص بھی اس میں اٹھے اسی ماحول کے اثرات لئے ہوئے اٹھے اور جو شخص بھی اس کے اندر داخل ہو جائے اس پر اسی کا رنگ چڑھ جائے''۔ (تدبر قرآن' جلد اول)۔

پرویزؒ صاحب اپنی کتاب ''معراج انسانیت'' میں تعلیم و تربیت کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلب انسانی سے۔ کسی شے کی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آ جائے تعلیم ہے۔ لیکن دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں اس کے لئے قلبی تبدیلی کی بھی ضرورت ہے جو درحقیقت اعمال انسانی کا سرچشمہ ہے۔ عمل کا جذبۂ محرکہ قوت ارادی ہے اور قوت ارادی کے منبع کو قلب کہا جاتا ہے۔ اسی کا نام ''انسانی ذات کی نشوونما'' ہے یعنی ان صلاحیتوں کی نشوونما جن سے شرف انسانیت عبارت ہے۔ ذات کی اسی نشوونما کو تطہیر قلب یا نگاہ کی تبدیلی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے ''نفسیاتی تبدیلی'' کی اصطلاح سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا ارادہ ہمیشہ صحیح سمت کی طرف رخ کرتا ہے۔ دنیا میں جسے ''نیکی'' کہا جاتا ہے وہ نیک ارادے ہی کے مظاہر کا نام ہے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں: ''تربیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ اس کے جوہر خوابیدہ کو بیدار کر کے انہیں بروئے کار لایا جائے اور انہیں صحیح نتائج مرتب کرنے کے قابل بنا دیا جائے۔ خود تزکیہ کے معنی نشوونما دینا' بالیدگی کی صلاحیت پیدا کرنا' اوپر ابھارنا' آگے بڑھانا ہیں۔''

یعنی تربیت کا مطلب ہوا اخلاقیات کو سنوارنا' اسے کردار سازی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ تربیت سے انسان کے اندر صبر' برداشت' دیانت' صداقت' خوف آخرت' عفو و درگزر اور دیگر اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا ہوتی ہیں جبکہ منکرات یعنی برے کاموں کے خلاف مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔ شر کے مقابلے میں خیر کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

تربیت.....انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اہم مقصد

تربیت انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد کا ایک اہم نکتہ رہا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے لئے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے دعا کرتے ہوئے کہا تھا: ''اے ہمارے رب' ان میں بھیج ایک رسول انہی میں سے جو ان کو پڑھ کر سنائے تیری آیتیں اور ان کو تعلیم دے کتاب و حکمت کی اور ان کا تزکیہ (تربیت) کرے'' (البقرہ:۱۲۹) معمولی تبدیلی کے ساتھ یہ آیت قرآن مجید میں تین دوسرے مقامات پر بھی دہرائی گئی ہے مثلاً سورہ البقرہ آیت:۱۵۱' سورہ آل عمران:۱۶۴ اور سورہ جمعہ:۲۔ صرف البقرہ کی آیت ۱۲۹ میں کتاب و حکمت کی تعلیم کا ذکر ''تزکیہ''

سے پہلے آیا ہے' باقی تینوں آیات میں تزکیہ کا ذکر کتاب و حکمت کی تعلیم سے پہلے ہے۔ اس سے تربیت کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جانا چاہئے کہ تربیت تعلیم سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

قوموں کا عروج و زوال

قوموں کے عروج و زوال میں تربیت کا ایک اہم کردار ہے۔ جناب پرویزؒ اپنی کتاب ''معراج انسانیت'' میں لکھتے ہیں: ''جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب اور تطہیر فکر پر نہیں ہے وہ نظام کبھی نشوونما وارتقاء انسانیت کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔ بہترین دساتیر وقوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کر سکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اوران پر عمل کرنے والی قوم کے قلب و نگاہ کی اصلاح نہ ہو چکی ہو۔ یہ تزکیۂ نفس یا قلب و نگاہ کی تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ ایک اونٹ چرانے والی قوم چند دنوں میں ایک نئی تہذیب کی مالک ہی نہ بن گئی بلکہ اس نے دنیا میں تہذیب وتمدن کے پیمانے بدل دیئے۔''

جب تک ملت اسلامیہ میں تزکیہ وتربیت کا نظام قائم رہا یہ عروج حاصل کرتی چلی گئی اور جب یہ نظام کمزور یا ختم ہو گیا تو ملت اسلامیہ کا ہر طبقہ وشعبہ زوال کا شکار ہو کر رہ گیا۔ یہ تزکیۂ قلب ہی کا نتیجہ تھا کہ قلیل مسلم سپاہ اپنے سے دس گنا لشکر پر بھی غالب آ جاتی تھی اور کفار کا بڑے سے بڑا لشکر بھی ان کے اندر خوف پیدا نہ کر سکتا تھا۔ آج مسلم ممالک کی افواج کی تعداد حملہ آور صلیبی فوج سے کئی گنا زیادہ ہے مگر چونکہ تزکیہ نام کی کوئی چیز نہیں اس لئے صرف ایک ٹیلی فون ہتھیار ڈالنے پر ہی نہیں بلکہ صلیب کی علمبرداری کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آج ہمارے دل سیاہ ہو چکے ہیں اور ہر قسم کی گندگی سے آلودہ ہیں کیونکہ رزق حرام سے جسم کی پرورش ہو رہی ہے۔ تزکیہ وتطہیر کا عملاً کوئی وجود نہیں ہے۔ جو لوگ اس کے علمبردار بننے کے دعوے دار ہیں' خود ان کی زندگی اس کی روح سے خالی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا: ''پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیز گاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرتا کہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن سے ریاکار اور بے دینی سے بھرے ہو''۔ (متی باب ۲۳)۔

اچھی تربیت اولاد کے لئے تحفہ

تربیت کی اہمیت کا اندازہ نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتا ہے: ''باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دیتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ یہ ہے کہ وہ اس کی تربیت و اصلاح کرے''۔ یعنی تربیت کو اولاد کے لئے بہترین تحفہ قرار دیا گیا ہے۔ اولاد کی تربیت کے حوالے سے تربیت کی اہمیت کا ذکر

علامہ اقبالؒ نے اس طرح کیا ہے۔

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

تربیت کی اہمیت کی چند مثالیں

۱۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا۔ اگر سڑک کو صحیح طریقے سے بنانے کے لئے اس پر کرش کیا ہوا پتھر (پتھر کی روڑی) ڈال کر بکھیر دیا جائے تو اس کے اوپر سے گزرنے والی ہر دسویں یا گیارہویں گاڑی پنکچر ہو جائے گی۔ دیگر نقصانات بھی ہوں گے۔ ایسی سڑک پر سے پیدل گزرتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ سڑک کو صحیح طور پر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ پتھر کے ساتھ ساتھ سڑک پر مخصوص قسم کی مٹی یا ریت بھی ڈالی جائے۔ پھر پانی لگا کر رولر کے ذریعے پتھر کی ابھری ہوئی نوکیں توڑ یا دبا کر ہموار کیا جائے۔ اس کے بعد صحیح تناسب کے ساتھ تارکول ملی باریک بجری ڈال کر دوبارہ رولر پھیرا جائے۔ جس سڑک پر ایسا نہیں ہوتا وہ معمول سے کہیں زیادہ حادثات کا سبب بنتی رہتی ہے۔ یہی صورت حال معاشرے میں بھی پیش آتی ہے۔ اگر معاشرے کی تعمیر کرنے والے اساتذہ اور ادارے طلبہ کو صرف تعلیم دینے کے بعد بغیر تربیت کے معاشرے میں داخل کریں گے تو وہ بھی نوکیلے پتھروں کی طرح معاشرے کی گاڑی کو پنکچر کرنے کی کوشش کریں گے۔ آج ہمارے معاشرے میں جو قتل و غارت ہو رہی ہے' اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نئی نسل کو تعلیم تو دے رہے ہیں مگر اس کی تربیت نہیں کر رہے۔ آج ہماری تعلیم یافتہ نسل کے نوکدار پتھر یعنی بدمعاش' کلاشنکوف بردار' ڈاکو' لٹیرے' رشوت خور' مذہبی جنونی دہشت گرد وغیرہ پوری قوم کی گاڑی کو پنکچر کر کے معاشرے میں فساد برپا کئے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کوئی مقدس جگہ بھی محفوظ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز سر بھی گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں۔ مسجدوں' امام بارگاہوں' قبرستانوں اور دیگر جگہوں پر خون بہانے والے ان پڑھ نہیں ہیں' ان کی اکثریت پڑھی لکھی ہے اور بعض دینی مدارس کے فارغ التحصیل بھی ہیں۔ ان سب نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی ایک بے گناہ انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے' اس کے باوجود وہ آئے روز درجنوں بے گناہ انسانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ اس لئے کہ تعلیم کے ساتھ ان کی اسلامی تربیت نہیں ہوئی اور یہ اچھے معمارِ قوم اور اصلاح کار بننے کے بجائے وحشی قاتل بن گئے۔

۲۔ دوسری مثال ایک ڈاکٹر کی ہے۔ کوئی فرد میڈیکل کی کتاب پڑھنے سے فزیشن یا سرجن نہیں بن جاتا۔ ایف۔ ایس۔ سی کے بعد ایک فرد باقاعدہ میڈیکل کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ پہلے دو سال کتابی تعلیم کے ساتھ وہ دیگر تجربات کے علاوہ مردہ جسم کی چیر پھاڑ کر کے جسم کے ایک ایک ریشے اور رگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس کے باوجود دو سال بعد کوئی فرد اسے زندہ جسم پر نشتر چلانے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ مزید تین سال تک سرجری وارڈ میں داخل مریضوں کے مشاہدہ کے ذریعے پروفیسر اسے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت دیتے ہیں۔ آپریشن تھیٹروں میں بھی وہ مسلسل آپریشنوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ایک سال ہاؤس جاب کے ذریعے مزید تربیت حاصل کرتا ہے۔ جب اس کا

ہاتھ ذرا کھلتا ہے تو سینئر سرجنز کی نگرانی میں اس سے چھوٹے چھوٹے آپریشن کرائے جاتے ہیں۔ مکمل سرجن بننے کے لئے مزید کئی سال تربیت میں گزارنے کے بعد اسے سرجری کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ جو طالب علم باقاعدگی کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں کرتے' آگے چل کر انہی کے ہاتھوں آپریشن خراب اور مریض ہلاک ہوتے ہیں۔ جو طالب علم تربیت کے تمام قواعد وضوابط سے گزر کر سرجن یا فزیشن بنتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں میں شفا کی قوت عطا کر دیتا ہے۔

۳۔ تیسری مثال ایک تیراک کی لیتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ کلاس روم میں تیراکی کے تمام اسباق پڑھا کر طالب علم سے کہا جائے کہ وہ اب تیراک بن گیا ہے۔ ایسا فرد اگر دریا میں کودے گا تو نہ صرف خود ڈوبے گا بلکہ اپنے ساتھی کو بھی ڈبو دے گا کیونکہ اس کی تعلیم تو ہوئی ہے مگر تربیت نہیں۔

۴۔ چوتھی مثال گاڑی کے ڈرائیور کی لیں۔ آپ کسی بھی فرد کو گاڑی چلانے کا ایک ایک سبق زبانی یاد کرا دیں مگر وہ گاڑی نہیں چلا سکے گا۔ گاڑی کا ڈرائیور بننے کے لئے اسے ایک تربیتی کورس سے گزرنا ہوگا۔ ایسا ہی جہاز کے پائلٹ کے لئے ضروری ہے۔

ان مثالوں سے ایک بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ تربیت کی کس قدر اہمیت وضرورت ہے۔ آج رشوت ستانی' دہشت گردی' بدعنوانی' ملاوٹ' بے حیائی' فرقہ واریت کا زہر غرضیکہ ہر بدی پھیلانے میں زیادہ تر غیر تربیت یافتہ صاحب تعلیم افراد ہی ملوث ہیں۔ یعنی تربیت کے بغیر تعلیم بھی نقصان دہ ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ تعلیم ایک دولت ہے' ایک آگ ہے۔ تربیت کے بغیر دولت گناہوں اور جرائم کی دلدل میں لے جا سکتی ہے۔ آگ کھانا پکانے اور سردیوں میں کمرے کو گرم کرنے کے بجائے جلا سکتی ہے۔ ہم نے بغیر تربیت کے تعلیم دے کر معاشرے کے لئے تعلیم کو آگ ہی تو بنایا ہے۔ آج پورا معاشرہ اس آگ میں جل رہا ہے۔

ترقی یافتہ غیر مسلم قوموں پر غور کریں۔ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا کوئی ضابطۂ حیات نہ تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے ہی بنائے ہوئے ضابطۂ حیات کے مطابق تعلیم کے ساتھ تربیت کا اہتمام کیا اور ترقی کی منزلیں طے کر لیں۔ مگر ہم مسلمانوں نے کیا کیا؟ ہمارے پاس تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مکمل ضابطۂ حیات بھی موجود تھا مگر ہم نے اس ضابطۂ حیات کے مطابق نئی نسل کی تربیت پر توجہ نہ دی اور یوں قوم فساد کا شکار ہوگئی۔ پاکستان کے انتظامی اداروں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ تربیتی اداروں میں بھی تربیت کے بجائے صرف تعلیم پر ہی توجہ دی جا رہی ہے۔ اسی لئے بیوروکریسی اور نوکر شاہی میں خدمت کا جذبہ پیدا ہوا نہ حرام و حلال کا شعور۔ رشوت و بدعنوانی کے بغیر ڈیوٹی دینے کا تصور ہی ان کے ذہن میں نہ آ سکا۔ دیانت' امانت' خدمت' صداقت کے الفاظ ہی ان کے لئے اجنبی ہوگئے۔ پاکستانی قوم کے ساتھ مزید المیہ یہ ہوا کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علماء نے قوم کو نظم وضبط' امانت' دیانت' صداقت اور خدمت خلق کا سبق پڑھانا اور اخلاقی تربیت کرنا تھی مگر وہ خود اخلاقی تربیت سے محروم ہیں۔ ان کے اندر فرقہ واریت ہے اور دوسرے مسالک سے نفرت وتعصب۔

تربیت کے بنیادی مقاصد

تربیت کے مقاصد کیا ہیں' اس کی تفصیل بڑی حد تک ''تربیت کی اہمیت وضرورت'' کے عنوان میں آ گئی ہے۔ مختصراً چند نکات دہرائے جا رہے ہیں:

۱۔ تربیت کے ذریعے بنی نوع انسان کے اندر سے شر کا خاتمہ کر کے بھلائی کو پروان چڑھانا تاکہ ایک فرد کے اہل و عیال اور بنی نوع انسان دوزخ کی آگ سے بچ سکیں۔ اولاد کی تربیت کا بنیادی مقصد اہل وعیال کو ''دوزخ'' سے بچانا ہی ہے (سورۃ تحریم:۶)۔ معاشرے کی تربیت کا مقصد معاشرے میں رہنے والے انسانوں کو دوزخ میں جانے سے بچانا ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی لئے آئے کہ وہ انسان کو دوزخ کی آگ سے بچا سکیں۔

۲۔ کرۂ ارض سے بدی وفساد کا خاتمہ اور نظام الٰہی کا قیام۔ ایک ایسے صالح معاشرے کا قیام جس میں بھلائی آسان اور بدی کرنا مشکل تر ہو۔ عدل وانصاف ہو۔

۳۔ تربیت کے ذریعے بنی نوع انسان کی مادی واخلاقی ترقی کرنا۔

۴۔ مہذب معاشرے کو وجود میں لانا۔

تربیت کیسے کی جائے؟

یہ ایک الگ تفصیلی موضوع ہے اور یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ تربیت کے بنیادی اصول کو سمجھانے کے لئے صرف ایک مثال ''فصل اور کسان'' کی رکھوں گا۔ بیج کے اندر پودا بننے کی ایک پوشیدہ صلاحیت ہوتی ہے۔ صرف کسان ہی اس پوشیدہ صلاحیت کو بیدار کر کے اسے پودا بناتا ہے۔ دوسرے لوگ تو بیج کو آٹا بنا دیں گے یا اس کا تیل نکال لیں گے یا پھر اسے پکا کر کھا جائیں گے۔ اپنی اولاد' اپنے شاگردوں یعنی نسل نو کی تربیت کے لئے کسان کو اپنے لئے مثال بنانا ہو گا۔ کسان زمین کو تیار کرتا ہے' پھر اس میں بیج بوتا ہے اور پانی دیتا ہے۔ کسان کی کوشش میں فطرت مدد کرتی ہے اور بیج کے اندر پودا بننے کی صلاحیت پروان چڑھنا شروع ہوتی ہے اور چند دنوں بعد اس میں سے ننھی منی جڑیں اور چھوٹا سا تنا نکل آتا ہے۔ کسان کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ مطلوب پودوں کے ساتھ جڑی بوٹیاں اور فالتو پودے بھی اگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے بھی حملہ آور ہوتے ہیں۔ کسان اپنے مطلوب پودوں کو ان سب سے بچاتا ہے۔ وہ نقصان دہ کیڑے مکوڑوں کو مارتا ہے' جڑی بوٹیاں اور فالتو پودے اکھاڑ کر باہر پھینک دیتا ہے۔ گوڈی کرتا ہے' کھاد اور پانی دیتا ہے تاکہ مطلوب پودوں کو متوازن خوراک ملے۔ وہ اپنے کھیت میں کوئی ایسی چیز برداشت نہیں کرتا جو اس کے پودوں کے لئے مضر ہو۔ جو کسان اور باغبان چوکنا رہتا ہے' اپنے کھیت اور باغ پر نظر رکھتا ہے' نقصان پہنچانے والی چیزوں کا خاتمہ اور پودوں کے لئے مفید چیزیں بہم پہنچاتا ہے اس کی فصل اور باغ خوب پھلتا پھولتا ہے اور اسے بھرپور منافع ملتا ہے جو کسان اور باغبان لاپروائی برتتا ہے' کیڑے مار دوائیوں کا چھڑکاؤ نہیں کرتا' بروقت کھاد اور پانی نہیں دیتا' گوڈی نہیں کرتا تو اس کے کھیت اور باغ شاذ و نادر ہی منافع دیتے ہیں۔ انسان کو بھی اپنی اولاد کی تربیت ایسے ہی کرنا ہو گی۔ نبی کریمؐ کا فرمان ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور فطرت اطاعت الٰہی

ہے۔ بچے کے اندر اسی پوشیدہ صلاحیت یعنی ''اطاعت الٰہی'' کو اجاگر کرنا اور پروان چڑھانا اس کی تربیت ہے۔ اس صلاحیت کو مضبوط کرنے کے لئے کتاب وحکمت کی تعلیم دینی ہے۔ تنے کو کمزور کرنے والے عوامل یعنی منکرات کی خواہشات اور جذبوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم سے کچلنا ہے۔ کسی بھی شر کو قریب نہیں پھٹکنے دینا۔ ماحول پر بھی نظر رکھنی ہے کیونکہ آندھیاں اور طوفان' ٹڈی دل کے لشکر اور کیڑے مکوڑوں کے حملے بھی فصلوں اور باغات کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ بچے کے دوستوں پر بھی نظر رکھنی ہے کہ رات کو گیدڑ اور سؤر بھی فصل اجاڑ دیتے ہیں۔ موجودہ ذرائع ابلاغ کا خطرہ کسی بھی بڑے تباہ کن سیلاب سے کم نہیں' اس سے بھی بچے کو بچانا ہے۔ جو والدین ایک اچھے کسان کے راستہ پر چلیں گے وہ اپنی اولاد کو منافع بخش پائیں گے۔ تربیت کا یہی بنیادی طریقہ ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ بیدار ڈائجسٹ' مئی 2004ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لغات القرآن

ص ل و (ی)

اگرچہ صلوٰۃ اور اس کے جملہ مشتقات کا تعلق (ص۔ل۔و) ہی سے ہے لیکن علمائے لغت نے اس ضمن میں بعض ایسے مشتقات بھی بیان کئے ہیں جو (ص۔ل۔ی) سے متعلق ہیں اور ان سے بھی صلوٰۃ کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے' اس لئے اس عنوان میں مادہ کے آخر کا ''واؤ'' اور ''ی'' دونوں ہی آ گئے ہیں۔ ویسے ہم نے (ص۔ل۔ی) کا ایک جداگانہ عنوان بھی رکھا ہے جو آگے آتا ہے۔ چونکہ ''صلوٰۃ'' دین کا ایک بنیادی گوشہ ہے اور قرآن کریم میں یہ اصطلاح اور اس کے متعلقات بڑی کثرت سے آئے ہیں اس لئے یہ عنوان بڑا اہم' اور اس کے مباحث خاص غور وفکر کے محتاج ہیں۔ ہم انہیں نسبتاً تفصیل سے بیان کریں گے۔

(۱) اَلصَّلاَ پشت کا درمیانی حصہ۔ کولھے کا ڈھلوان یا وہ حصہ جس پر جانور کی دم لگے۔ دم کے دونوں جانب کے حصے صلوان کہلاتے ہیں۔ اس کی جمع صلوٰت یا اصلاء آتی ہے (تاج)۔ صلا۔ یصلو۔ صلوا کے معنی ہیں صلا (مذکورہ صدر حصہ) پر مارنا۔ صلوتہ۔ میں نے اس کے صلا پر مارا۔

(۲) الصلا کی نسبت سے 'صلی الفرس تصلیۃ اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑ دوڑ میں' دوسرے نمبر کا گھوڑا' پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طرح دوڑ رہا ہوں کہ پچھلے کی کنوتیاں' پہلے کی سرین سے مل رہی ہوں۔ اس گھوڑے کو جو آگے جا رہا ہو' سابق کہتے ہیں اور دوسرے نمبر والے گھوڑے کو المصلی۔ اس سے صلیٰ کے معنی ہیں اگلے کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے آنا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی ایک روایت میں ہے سبق رسول اللہ۔ و صلی ابوبکر و ثلث عمر و خبطتنا فتنۃ۔ ''رسول اللہؐ پہلے تشریف لے گئے اور آپ کے پیچھے پیچھے ابوبکرؓ اور ان کے پیچھے عمرؓ بھی چلے گئے اور ہمیں فتنوں نے بدحواس کر دیا (تاج)''۔

(۳) تاج میں ہے کہ صلی و اصطلی کے معنی لزوم یعنی وابستگی کے ہیں۔ یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنا اور چمٹے رہنا۔ اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو ہے لم نک من المصلین (۷۴/۴۳)۔ ''ہم مصلین میں سے نہیں تھے''۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ''ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے''۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس جہت سے صلوٰۃ کے معنی ہونگے احکام الٰہی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا اور

کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ لہٰذا اتصلیۃ کے معنی ہیں اگلے کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں میں فاصلہ نہ ہو لیکن پیچھے چلنے والا آگے جانے والے سے آگے نہ بڑھے بلکہ وابستگی سے اس کا اتباع کرے۔

(۴) ان تصریحات سے صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے؟ خدا اس ذات (Personality) کا نام ہے جو بلند ترین، مکمل ترین، مستحکم ترین، اور حسین ترین ہے۔ اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے (اور اسے ''روحنا'' کہہ کر پکارا ہے۔ دیکھئے عنوان روح)۔ یہ ذات، ذات خداوندی کے مقابلہ میں محدود اور پست درجہ کی ہے۔ اسے اپنی نشوونما کے لئے صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھنا ہوتا ہے۔ ہم خدا کی ذات کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے البتہ اس نے اپنی جو صفات وحی کے ذریعہ (قرآن کریم میں) بیان کی ہیں ان صفات کا اپنے اندر اجاگر کرتے جانا انسانی ذات کی نشوونما کا موجب بنتا ہے۔ قرآن کریم نے صفات خداوندی کو ''الاسماء الحسنٰی'' سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان اسماء (صفات) خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ کر، ان کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے (یعنی جس نصب العین کے حصول کو ہمارے لئے مقصد زندگی تجویز کیا گیا ہے) وہ یہ ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم (۱/۵)۔ یعنی اس توازن بدوش راستے کی طرف راہنمائی کی تمنا جو ہمیں انسانیت کی منزل مقصود تک لے جائے اور سورہ ھود میں ہے ان ربی علی صراط مستقیم (۱۱/۵۶)۔ ''میرا رب صراط مستقیم پر ہے''۔ یعنی جس صراط مستقیم پر چلنے کے لئے مومنین سے کہا گیا ہے وہ وہی راستہ ہے جس پر خدا کائنات کو چلا رہا ہے۔ ہم اس راستے پر کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے سے چل سکتے ہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم ہے کتاب اللہ کے ساتھ پوری پوری وابستگی سے اپنے اندر (علی حد بشریت) صفات خداوندی کا منعکس کئے جانا۔

(۵) سورۃ نور میں ہے الم ترا ان اللہ یسبح لہ من فی السموٰت والارض والطیر صفت۔ کل قد علم صلاتہ و تسبیحہ (۲۴/۴۱)۔ ''کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ وہ ہے کہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرند بھی۔ ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے''۔ یعنی کائنات کی ہر شے اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو اچھی طرح جانتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے (اپنی فطری جبلت کی رو سے) جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ اسے کس راستے پر چلنا اور کس منزل تک پہنچنا ہے۔ اس کی جدوجہد کے دوائر کون سے ہیں۔ اسی چیز کو ان کی صلوٰۃ اور تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے (تسبیح کے لئے دیکھئے عنوان س۔ب۔ح)۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کو ان چیزوں کا علم (حیوانات کی طرح) جبلی طور پر نہیں دیا گیا۔ اسے یہ سب کچھ وحی کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ جہاں تک اس کی طبعی ضروریات کا تعلق ہے، انسان ان چیزوں کا علم، عقل وفکر اور تجربہ ومشاہدہ سے حاصل کر سکتا ہے لیکن جہاں تک اس کی ''انسانیت'' کے تقاضوں کا تعلق ہے یہ چیزیں وحی کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا انسان کو یہ جاننے کے لئے کہ اس کی ''صلوٰۃ وتسبیح'' کیا ہے، وحی کا ماننا اور جاننا ضروری ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے وحی کے دیے ہوئے پروگرام پر عمل کرنا لازمی ہے۔ اسے قرآن کریم نے اقامت صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (و یقیمون الصلوٰۃ ۲/۳)۔ یعنی قوانین

خداوندی کا اتباع کرنا۔

لیکن وحی کے دیئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہونا (اقامت صلوٰۃ) انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہی یہ بتایا ہے الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف و نھوا عن المنکر (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے (زکوٰۃ کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ز۔ک۔و)۔ اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے"۔ انہی کو دوسری جگہ الراکعون الساجدون (۹/۱۱۲) کہا ہے۔ یعنی رکوع کرنے والے' سجدہ کرنے والے۔ (رکوع اور سجدۃ کے لئے دیکھئے عنوانات ر۔ک۔ع اور س۔ج۔د)۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ اقامت صلوٰۃ اور امور مملکت کے لئے باہمی مشاورت کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ اقاموا الصلوٰۃ و امرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)۔ "وہ اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں"۔ اور چونکہ جماعت مومنین کی زندگی کے تمام امور قوانین خداوندی (کتاب اللہ) کے مطابق سرانجام پاتے ہیں اس لئے سورۃ اعراف میں تمسک بالکتاب اور اقامت صلوٰۃ کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے (۷/۱۷۰)۔ لہٰذا اقامت صلوٰۃ سے مفہوم ہے ایسا نظام (یا معاشرہ) قائم کرنا جس میں تمام افراد قرآن کریم کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں' اور یوں کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہیں۔ اس مقصد کی مزید وضاحت کے لئے قرآن کریم میں صلی کے مقابلہ میں تولی کا لفظ آیا ہے (۳۱-۳۰/۷۵)۔

تولی کے معنی ہیں صحیح راستہ سے روگردانی کرنا' گریز کی راہیں نکالنا' پھر جانا' منہ موڑ لینا۔ اس لئے صلی کے معنی ہوئے قوانین خداوندی کے مطابق صحیح راستہ پر چلتے جانا۔ نظام خداوندی کے متعین کردہ فرائض منصبی کو ادا کرتے جانا۔ علامہ حمید الدین فراہی نے اسی اعتبار سے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے ایک معنی کسی کی طرف بڑھنے' رخ کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں (مفردات القرآن)۔ سورۃ علق میں ہے۔ اَرء یت الذی ینھی عبدا اذا صلی (۹۶/۹-۱۰)۔ یعنی جب خدا کا بندہ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنا چاہتا ہے تو یہ (مخالف) اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے۔

ان فرائض منصبی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کو یہ محیط نہ ہو۔ چنانچہ سورہ ھود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ سے ان کی قوم نے کہا کہ اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد آبائونا او ان نفعل فی اموالنا مانشؤ (۱۱/۸۷)۔ "کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا اختیار کئے چلے آرہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں"؟ یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسی صلوٰۃ ہے جو معاشیات تک کو بھی اپنے دائرے کے اندر لے لیتی ہے۔ اس سے بھی صلوٰۃ کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں' قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا نام صلوٰۃ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو) بات سمٹ سمٹا کر یہاں آجاتی ہے کہ انسان اپنے معاملات کا فیصلہ اپنی مرضی (خواہشات اور جذبات) کے مطابق کرنا چاہتا ہے یا وحی خداوندی کے مطابق؟ اپنے تمام معاملات کو وحی خداوندی کے تابع رکھنے کا نام "اقامت صلوٰۃ" ہے۔ چنانچہ سورۃ مریم میں "اقامت صلوٰۃ" اور "اتباع جذبات" کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اس

مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے فخلف من بعدھم خلف اضاعو الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات..... (۱۹/۵۹)۔ (انبیائے کرام کے بعد) ''ایسے ناخلف پیدا ہو گئے کہ انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنے جذبات و خیالات (اپنی خواہشات) کے پیچھے چلنے لگ گئے'' گویا انسان کا اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا صلوٰۃ کو ضائع کر دینا ہے اور قوانین خداوندی کے پیچھے چلنا صلوٰۃ کا قائم رکھنا ہے۔ سورۃ انعام میں ''محافظت صلوٰۃ'' کو آخرت اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کے مرادف قرار دیا گیا ہے۔ (۶/۹۳)۔ اسی بنا پر ابن قتیبہ نے الصلوٰۃ کے معنی الدین کئے ہیں (القرطین۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۳' یہ معنی محیط اور اقرب الموارد نے بھی دیئے ہیں۔)۔ یعنی اقامت صلوٰۃ درحقیقت اقامت دین ہے۔

(۶) الصلّیٰ کے معنی آگ اور ایندھن کے ہیں۔ اس سے صلی عصاہ علی النار کے معنی ہیں' اس نے اپنی لکڑی (لاٹھی) کو آگ دکھا کر نرم اور سیدھا کیا۔ سلب ماخذ کے اعتبار سے صلی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اس نے آگ کو ہٹایا اور دور کیا۔ (روح المعانی)۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو صلوٰۃ کے معنی ہوں گے اپنی خامیوں کو رفع کرنا۔ صاحب المنار نے کہا ہے کہ صلوٰۃ قولاً و عملاً اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اپنی خامیوں کو رفع کرنے کے لئے' نقائص سے بالاتر ایک ذات (کی راہنمائی) کے محتاج ہیں۔ اسی جہت سے قرطبی نے کہا ہے کہ صلوٰۃ درحقیقت خدا کی محکومیت اور اطاعت کو کہتے ہیں۔

(۷) صلوٰۃ کے ایک معنی جھکانا اور کسی کو اپنی طرف مائل کرنا بھی ہیں (محیط۔)۔ اس جہت سے صلوٰۃ کا مفہوم ہوگا۔ کائنات کو مسخر کرنا اور اسے اپنے تابع فرمان بنانا۔

(۸) الصلوٰۃ کے ایک معنی تعظیم کے بھی ہیں (تاج)۔ یعنی اپنے عملی پروگرام سے کائنات کو نشوونما دینے والے (رب العالمین) کی عظمت کو ثابت کرنا۔ اس سے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے مطابق ایسا پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عملاً چلنا جس سے تمام نوع انسان کی نشوونما ہوتی جائے۔

(۹) صلوٰۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں' ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن' زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے' وہ فریضۂ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت' مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

(الف) یایھا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوۃ فاغسلوا وجوھکم و ایدیکم الی المرافق و امسحوا برء وسکم و ارجلکم الی الکعبین۔ (۵/۶)۔

''اے ایمان والو! جب تم صلوٰۃ کے لئے کھڑے ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔'' اس کے بعد ہے کہ اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمّم کر لیا کرو۔

(ب) سورۃ نساء میں ہے یایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاریٰ۔ حتیّٰ تعلموا ماتقولون (۴/۴۳)۔

''اے ایمان والو۔ تم صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم حالت سکر (نشہ یا نیند) میں ہو۔ تا آنکہ تم جو کچھ منہ سے کہو اسے سمجھو (کہ کیا

کہہ رہے ہو)''۔اس کے بعد پھر تیمّم کا ذکر ہے۔(بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں مساجد میں جانے کا ذکر ہے۔لیکن یہ بحث الگ ہے)۔

(ج) نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے کہ اذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوۃ فلتقم طائفۃ منھم معک و لیاخذوا اسلحتھم۔ فاذا سجدوا ولیکونوا من ورائکم۔ ولتات طائفۃ اخری لم یصلوا فلیصلّوا معک ولیاخذوا حذرھم واسلحتھم.....(۴/۱۰۲)۔

''اور جب تو ان کے درمیان ہو۔ پھر ان کے لئے قیام صلوٰۃ کرے۔تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو اور چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور چاہئے کہ دوسرا گروہ جنہوں نے صلوٰۃ ادا نہیں کی وہ تیرے ساتھ صلوٰۃ ادا کریں۔ اور وہ اپنے بچاؤ (کا سامان) اور اپنے ہتھیار لئے رہیں۔'' اس کے بعد ہے فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبکم۔ فاذا طمانتم فاقیموا الصلوٰۃ.....(۴/۱۰۲)۔''پھر جب تم صلوٰۃ ادا کر چکو تو کھڑے، بیٹھے، لیٹے جس طرح جی چاہے اللہ کا ذکر کرو۔ پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو تو قیام صلوٰۃ کرو۔''

اس سے پہلی آیت یہ ہے فاذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ۔ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا.....(۴/۱۰۱)۔''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو اس میں تمہارے لئے حرج کی بات نہیں کہ تم صلوٰۃ کو کم کر لو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کفار (مخالفین) تمہیں تکلیف پہنچائیں گے۔'' اس ضمن میں (۲/۲۳۹) بھی دیکھئے۔

صلوٰۃ کے کم کرنے کا طریق (۴/۱۰۲) میں بیان ہو چکا ہے۔

(د) سورہ مائدہ میں ہے و اذا نادیتم الی الصلوۃ اتخذوھا ھزوا ولعبا .....(۵/۵۸)۔''اور جب تم صلوٰۃ کے لئے آواز دیتے ہو تو (مخالفین) اسے ہنسی اور مذاق (کھیل) بنا لیتے ہیں۔'' سورۃ الجمعۃ میں ہے اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع۔ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ فازا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون .....(۱۰-۹/۶۲)۔''جب جمعہ کے دن (یا اجتماع کے وقت) صلوٰۃ کے لئے بلایا جائے تو ''اللہ کے ذکر'' کی طرف جلدی آ جایا کرو اور کاروبار کو چھوڑ دیا کرو۔ اگر تمہیں (اس کی اہمیت کا) علم ہو (تو تم اس حقیقت کو محسوس کر لو گے کہ) یہ تمہارے لئے (کس قدر) بہتر ہے۔ پھر جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو اور ''اللہ کا بہت ذکر کرو''۔ تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔اس کے بعد ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں جب کاروبار یا کھیل تماشہ نظر آ جاتا ہے تو اس کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے ہاں سے تمہیں مل سکتا ہے وہ کھیل اور کاروبار سے کہیں بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔(۱۱/۶۲)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔(نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ پہلوی زبان کا ہے)۔ان اجتماعات کے سلسلہ میں ایک بات خاص طور پر سمجھنے

کے قابل ہے۔ جیسا کہ (ع۔ب۔د) کے عنوان میں وضاحت سے بتایا جائے گا' قرآن کریم کی رو سے ''خدا کی عبادت'' سے مفہوم اس قسم کی ''پرستش'' یا ''پوجا پاٹ'' نہیں جو عام طور پر اہل مذاہب کے ہاں پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کا مفہوم خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت یا ''اللہ کی محکومیت اختیار کرنا ہے''۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ محکومیت' زندگی کے ہر سانس اور کاروبار حیات کے ہر شعبہ میں اختیار کی جائے گی۔ اس کی عملی شکل وہ نظام مملکت ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق متشکل کیا جاتا ہے۔ اسی نظام کے حاملین کے متعلق فرمایا و الذین استجابوا لربھم و اقاموا الصلوۃ و امرھم شوریٰ بینھم و مما رزقنھم ینفقون (۴۲/۳۸)۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کی اطاعت کرتے ہیں اور اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے اور جو کچھ ہم انہیں دیتے ہیں وہ اسے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) کھلا رکھتے ہیں''۔ ان آیات میں' اطاعت خداوندی' اقامت صلوٰۃ اور امور مملکت کے طے کرنے کے لئے باہمی مشاورت کا ارتباط غور طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے نفاذ کے متعلق ضروری امور کا فیصلہ کرنے کے لئے باہمی مشاورت کی ضرورت ہوگی' اور مشاورت کے لئے اجتماعات بھی ضروری ہوں گے۔ وسیع معنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اجتماعات بجائے خویش ''اقامت صلوٰۃ'' ہی کا ایک حصہ ہوں گے۔ لیکن ان اجتماعات میں ایک اور حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ (ر۔ک۔ع) اور (س۔ج۔د) کے عنوانات میں لکھا جا چکا ہے' انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے' اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم و غصہ' خوشی' تعجب' عزم و ارادہ' ہاں اور نہ' وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار' انسان کی طبعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزت و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے ''سر تسلیم خم'' ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے' اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا' لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو' اس سے روکتا بھی نہیں' بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آئی ہے' وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار' اجتماعی شکل میں ہو' تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے' ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دے گا۔ احترام و عظمت' انقیاد و اطاعت اور فرماں پذیری و خود سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا' بجائے خویش بہت بڑی تربیت نفس ہے۔ یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ ہے جذبات اطاعت و تسلیم کے اظہار کی وہ منضبط شکل (صلوٰۃ) جسے قرآن کریم' جماعت مومنین کی مجالس و مشاورت کا ضروری حصہ قرار دیتا ہے۔ (جس طرح آج کل ہمارے ہاں جلسوں کی کارروائی کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جاتا ہے اگرچہ یہ چیز محض رسماً ادا کر دی جاتی ہے)۔ (و الذین استجابوا الربھم و اقاموا الصلوٰۃ۔ وامرھم شوری بینھم) ان اجتماعات کی اہمیت کے پیش نظر' قرآن کریم نے انہیں کتابا موقوتا (۴/۱۰۳) کہا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ''خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ''۔ اور دوسرے معنی ہیں ''ایسا فریضہ جو وقت پر ادا کیا

جاتا ہے''۔ اجتماعات کے لئے وقت کی پابندی جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے سورۃ الجمعہ کی جو آیت پہلے درج کی جاچکی ہے' اس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ جب اس اجتماع کے لئے بلایا جائے' تو اسے تمام دیگر مصروفیات پر ترجیح دو۔ تمام کاروبار چھوڑ کر فوراً اس طرف آجاؤ اور جب تک اس سے فارغ نہ ہو جاؤ کسی اور کام کی طرف دھیان مت دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا امیر' تمہارے سامنے ضروری معاملات پیش کر رہا ہو' ان کی اہمیت سمجھا رہا ہو' اور تم کاروبار کے لئے باہر نکل جاؤ۔ (وترکوک قائما)۔

یوں تو جماعت مومنین کی ساری زندگی' دن رات' صبح شام' قوانین خداوندی کی اطاعت اور ان کے نفاذ کی تگ و تاز میں گزرتی ہے' لیکن اجتماعات کے لئے خاص اوقات کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ خواہ یہ اجتماعات معمولاً منعقد ہوں یا ہنگامی طور پر بلائے جائیں۔ ذہن انسانی کی توہم پرستیوں نے' جہاں زندگی کے اور گوشوں میں ''سعد و نحس'' کے افسانے تراشے تھے وہاں دن اور رات کے بعض اوقات کے لئے بھی اسی قسم کے تصور قائم کر رکھے تھے۔ سورج نکلتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ زوال کے وقت یوں نہیں کرنا چاہئے۔ دن اور رات کے ملتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے جہاں اور توہم پرستیوں کا خاتمہ کر دیا وہاں اوقات کے سلسلہ میں بھی یہ کہہ کر بات واضح کر دی کہ دن اور رات میں نہ کوئی ساعت نحس ہے نہ سعد۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک اجتماعات صلوٰۃ کا تعلق ہے۔ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل۔ و قران الفجر ......(۱۷/۷۸)۔ تم ''دلوک الشمس'' سے رات کی تاریکی تک اقامت صلوٰۃ کرسکتے ہو اور صبح کے وقت کا قرآن بھی۔ (د۔ل۔ک) کے عنوان میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ''دلوک'' میں' صبح سے شام تک کا سارا وقت آجاتا ہے' بالخصوص جب سورج کے بلند ہونے۔ نصف النہار تک پہنچنے' مائل بہ زوال ہونے اور غروب ہو جانے کی مختلف منازل کو (خاص طور پر) اس میں شامل کرنا مقصود ہو۔ ان مختلف منازل کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود' ان توہم پرستیوں کی تردید تھا جن کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ انہی کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ و اقم الصلوٰۃ طرفی النہار و زلفا من الیل (۱۱/۱۱۴)۔ ''دن کے دونوں اطراف اور رات کے حصوں میں اقامت صلوٰۃ کرو''۔

ان اوقات کا ذکر تو خصوصیت سے لفظ صلوٰۃ کے ساتھ کیا گیا ہے' ویسے اقامت دین کے سلسلہ میں جماعت مومنین کی تگ و تاز کے سلسلہ میں (جسے قرآن کریم تسبیح و تحمید و تذکیر کے اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے) دن' رات کے تمام اوقات کا ذکر آیا ہے۔ دیکھئے (۳/۱۹۰)' (۲۰/۱۳۰)' (۵۰/۳۹)' (۵۲/۴۹) وغیرہ۔

سورۃ نور میں صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشاء کا ذکر (ضمناً) آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھر کے ملازمین کو چاہئے کہ وہ تمہاری (Privacy) کے اوقات میں' اجازت لے کر کمرے کے اندر آیا کریں۔ یعنی من قبل صلوٰۃ الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ و من بعد صلوٰۃ العشا (۲۴/۵۸) ''صلوٰۃ الفجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو کپڑے اتار دیتے ہو اور صلوٰۃ العشاء کے بعد''۔ اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اجتماعات صلوٰۃ کے لئے (کم از کم) یہ دو اوقات متعین تھے۔ جبھی تو قرآن کریم نے ان کا ذکر نام لے کر کیا ہے۔

جہاں تک صلوٰۃ میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے' یہ ہم دیکھ

چکے ہیں کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم کیا پڑھ رہے ہو(۴/۴۳)۔دوسرے مقام میں ہے ولا تجھر بصلاتک ولا تخافت بھا۔ وابتغ بین ذالک سبیلا (۱۱۰/۱۷)۔''اور اپنی صلوٰۃ کو نہ تو بلند آواز سے ادا کر اور نہ خاموشی سے۔ ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کر''۔ بعض لوگوں کا خیال ہے اس آیت میں صلوٰۃ سے مراد عام دعا یا ذکر ہے۔ نماز نہیں۔لیکن یہ خیال صحیح نظر نہیں آتا۔''ذکر'' کے متعلق قرآن کریم میں بہ صراحت موجود ہے(۲۰۵/۷) کہ اسے خاموشی سے دل میں کرنا چاہئے۔ بہ آواز بلند نہیں۔(ذکر سے مراد قانون خداوندی کی یاد ہے)۔اس لئے مندرجہ بالا آیت میں صلوٰۃ سے مراد''نماز'' ہی ہوسکتی ہے۔قرطبی نے اس کے معنی قرأت لکھے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں صلوٰۃ سے مراد اجتماعات صلوٰۃ ہیں۔(اس کے لئے فعل صلی۔ یصلی آتا ہے)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں ''اقیموا الصلوٰۃ'' کہا ہے وہاں' بہ ہیئتِ مجموعی' اس سے مراد ہے' اقامتِ دین۔ (یعنی نظام خداوندی کی تشکیل و استحکام)۔ قوانین و احکام خداوندی کا اتباع۔ ان فرائض منصبی کی ادائیگی جو ایک عبد مومن پر عائد ہوتے ہیں۔لیکن بعض مقامات پر اس سے مراد ہیں اجتماعاتِ صلوٰۃ جو خود دین کے نظام کا جزو ہیں۔متعلقہ مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہاں اقامت صلوٰۃ سے مقصود کیا ہے۔اسی طرح جہاں جہاں ''مصلین'' آیا ہے وہاں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے مراد جماعت مومنین (بہ ہیئت مجموعی) ہے یا صرف اجتماعات صلوٰۃ میں شرکت کرنے والے' اس لئے کہ قرآن کریم نے ان ''مصلین'' کا بھی ذکر کیا ہے جو شرفِ انسانیت کی بلندیوں پر ہیں (دیکھئے (۳۵-۲۲/۷۰)۔ اور ان کا بھی جن کے لئے تباہی ہے(۷-۴/۱۰۷)۔

(۱۰) صلی علیہ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تعظیم کرنا۔ دعا دینا۔حوصلہ افزائی کرنا۔ پروان چڑھانا۔نشوونما دینا۔کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا(راغب وتاج)۔

ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کے ان مقامات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جن میں یہ مادہ علیٰ کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔مثلاً سورۃ احزاب میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے ھو الذی یصلی علیکم و ملٰئکتہ..... (۳۳/۴۳)۔''خدا اور اس کے ملائکہ (کائنات قوتیں) تمہاری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ تمہاری کوششوں کو پروان چڑھاتے ہیں''۔ یہ ان مومنین کے متعلق ہے جن کی بابت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ جب انہیں اقامت دین کے سلسلہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان سے گھبراتے نہیں۔حوصلہ نہیں ہارتے' بلکہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔اولئک علیھم صلوٰۃ من ربھم (۲/۱۵۷)۔یہ لوگ خدا کے نزدیک مستحق تبریک وتہنیت ہیں۔انہیں خدائی تائید و نصرت حاصل ہے۔ خدا ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ان کی کوششوں کو کامیاب بناتا ہے۔انکی نشوونما کرتا ہے۔ یہ تو رہا عام جماعت مومنین کے متعلق۔خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ ان اللہ و ملٰئکتہ یصلون علی النبی..... (۳۳/۵۶)۔خدا اور اس کے ملائکہ نبیؐ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ یایھا الذین امنوا۔ صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ (۳۳/۵۶)۔''اے جماعت مومنین! تم بھی اپنے نبیؐ کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اس کا ساتھ دو۔ اس کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں اس کی مدد کرو اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو''(۴/۶۵)۔و تعزروہ و توقروہ

(۹/۴۸)۔ (تاکہ) تم اس کی مدد کرو۔ اس کی عزت وتوقیر کرو۔ مومنین کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے و عــزروہ و نصــروہ (۷/۱۵۷)۔ ''جنہوں نے اس کی تائید و تعظیم کی۔ اسکی مدد کی''۔ اس طرح کہ واتبعوا النور الذی انزل معه (۷/۱۵۷) ''جو روشن (کتاب) ہم نے اس کے ساتھ نازل کی ہے اس کا اتباع کیا''۔ یہ ہے مومنین کی طرف سے صلــوا علیــہ کے فریضہ کی ادائیگی کا طریق۔

یہ ہے خدا اور اس کے ملائکہ کی صلوٰت جماعت مومنین پر اور خود نبی اکرم ﷺ پر۔ اور یہ ہے جماعت مومنین کا صلوٰۃ وسلام نبی اکرم ﷺ پر۔ آپ نے غور فرمایا کہ صلــوا علیه و سلموا تسلــیما کا حکم کتنے عظیم عملی پروگرام کا متقاضی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے اس دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کرنا جسے نبی اکرمؐ لے کر تشریف لائے تھے۔

دوسری طرف نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ جب جماعت مومنین کے افراد انفــاق فــی سبیل الله کے لئے تیرے پاس اپنی کمائی لے کر آئیں تو اسے قبول کر و صل علیهم۔ ان صلـوتـک سکـن لهـم (۹/۱۰۳)۔ اور انکی حوصلہ افزائی کر۔ اس لئے کہ تیری طرف سے حوصلہ افزائی (Encouragement)، تحسین وتبریک (Appreciation)، ان کے لئے موجب تسکین ہوتی ہے۔ وہ اس انفاق فی سبیل الله کو قــربت عندالله وصلوت الرسول (۹/۹۹) کا موجب سمجھتے ہیں۔ یعنی قرب خداوندی کا باعث اور رسول کی طرف سے تحسین وتبریک اور حوصلہ افزائی کا موجب۔ (''قرب خداوندی'' کے لئے ق۔ر۔ب کا عنوان دیکھئے)۔

(۱۱)　لغت عبرانی میں صلوٰت یہودیوں کی عبادت گاہوں کو بھی کہتے ہیں۔ (۲۲/۴۰) میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔

HAVE THE TIMES CHANGED?

By
Aboo B. Rana
==========

In this age of aggression and nothing but aggression, there is today, one sentence on the lips of each and every struggling person. And that is, *"Times are no more the same."* In other words, we are saying that time has changed. Or is it, we are saying, *'We cannot control ourselves in this enthralling technology that has numbed our senses and is playing with our minds?'* The bottom lines being, let bygones be bygones, bury the past and let us follow the leaders of the present world. On the surface, this appears very cogent and reasonable.

Sure enough, we wash our clothes in the laundry machines now. We prefer to use pressure cookers instead of steel pots. The majority uses rickshaws and minivans, instead of cycle rickshaws or horse driven tongas. Our currency has changed from coins to paper and we now are shifting to plastic currency. In the west, one hardly carries too much cash in the wallet. Most of the monetary transactions are done with plastic money. Change, debit or credit cards which are secured by companies with a toll-free number, in case they are lost or stolen, that is only a phone call away. Electric bulbs have taken the place of kerosene oil lamps. In the recent past, public cinemas are being converted into shopping malls and plazas. We now, those who can afford it, like to watch movies on large TV screen format in the comfort of our drawing rooms. Satellites help us in reaching remote corners of our planet. Or better to say, the far corners of our solar system. Those of us who have access to computers, correspond with each other through the system of electronic mail, or email in brevity, instead of the postman who brought us good and bad news from relatives and friends, living far away. In fact, the list goes on and we can write pages, on the transformations that are dramatically changing and affecting our lifestyles. So we are being made to think, *"Times have changed!"*

Sitting in front of my computer, the voice of the cock that is crowing outside, is the same since I was a kid. As I turned my head and took a view, outside the window of my room, I hardly noticed any change. The sun shone in the same manner as it has being doing, long before we human beings even appeared on the surface of this earth. It still rises in the east and sets in the west. Times have not changed that. The bougainvilleas in the garden outside have also seen numerous seasons change in the past two scores, ten and some odd years of my lifetime, they are still the same. The birds and the bees story is still going on in the same way for, who knows, monkeys years. As the day will come to its last moments, the light will change into different warm hues of oranges, reds and purples on the horizon. I am sure of that. This procedure has also stayed the same; maybe you can add to my knowledge and tell me, since when? That makes me think, **"Have the times changed?"** No matter how fast I live my life, the clock will still be running at the same rate of 60 seconds a

minute and 60 minutes an hour. I and the people of my generation will have long vanished from this world, and the watches will indeed, still be running at the same rate. Do we doubt that? Really? **"Have the times changed?"**

We are all being born, with an odd exception now and then, with a head on our shoulders, a body, two arms and two legs. With lips to speak like a parrot, gobbledygook, smile or laugh. We are still being given eyes by nature, with which to read, to pay attention and observe the world outside. Indeed, we still have ears, if we care to listen. Don't we all feel hungry? We all need sleep in order to rest. Our bodies have not changed since Adam. We still love, if we are healthy and hate each other, when surroundings make us sick. Each one of us wants to live, if we are made to feel wanted. In isolation, we are struggling to live every day of our lives. These feelings were flowing within us, for monkey's years. The words of the Quran have not changed. We can still organize ourselves and live in peace, like those who did before us. Whenever and at any time, any authority wants, these words will be alive. These words are here to stay, forever, to guide those of us, who love life. The words of the Quran shall stay the same, forever, even if the owls stop looking and the cocks stop crowing. Have we ever given a thought, why Allah does not want to change His words? Times never change. Let me say, it is our vision of life that has changed. Maybe I am out of time.

Tell me really? **"Has the real time changed?"**

===================

Liberty as defined in the Quran

An excerpt chapter from the English translation of Quran aur Pakistan

By

Saleena Karim

==========

Looking back through history, we can see how different societies have gone through revolutions, different languages, different technologies, and different social structures. Despite these differences however, one thing has remained constant in every society ever since human consciousness awoke: the desire for freedom. Thus if we were to sum up human history, we could say that it comes down to the struggle for this freedom. People who have sacrificed their lives in this cause have become heroes, and those who have given up the freedom of their nations in exchange for material gain have been remembered only as traitors with no dignity.

This is an historical fact, but regardless of the huge sacrifices and the struggle, it has so far eluded humans as to what freedom really is. Even top ranking scholars cannot provide a fixed definition of freedom. I (Parwez) currently have in my possession a copy of the book 'Social Justice', edited by Richard B. Brandt, in which the most famous political science figures have been mentioned or cited, including Hobbes, Spencer, Kant, Mill, Hart, Rousseau, Popper, Marx, and Engels. From each of these figures we have acquired varying definitions for the meaning of liberty. Brandt uses their different viewpoints to assert his own view that there is no comprehensive definition for it, at least from an historical point of view. However he notes that in today's world there seems to be one universal belief about what constitutes freedom. It s the right of the people to govern their native land.

When a nation is occupied by another (as happens with imperialism), the natives of the occupied country consider themselves to be slaves, or oppressed. The belief is that if they remove the occupying nation and run their country themselves, then their country is free. When India was still part of the British Empire, (locally termed the *Samraaj* – meaning to be ruled by an 'outside government'), the opposing nationalist movement operated on this very principle – that restoring India to native rule would mean liberty. The opposing movement was called *Sawaragia*, meaning to rule by 'native government'.

At the time Ghandi coined a religious term for the objective of the movement, *Ram Rajia* – meaning 'Ram's Kingdom' – borrowed from the well known idiom of the Muslims, *Hakumat-e-Khuda-Wandi* (Allah's Kingdom), but it didn't catch on. The notion of *Sawarajia* for India's freedom remained more popular, its objective being to remove the British and bring in native rule. Fighting alongside the Hindus were well known Muslim political and religious leaders, for example Maulana Abu-

al-Kalaam Azad and Maulana Hussein Ahmed Madni, who were calling the struggle for freedom a *Jihad* against the British. The Hindu and Muslim campaigners were united firmly by this principle.

It was when the movement reached a critical point that for the first time a voice was raised in opposition of the Muslim campaigners. The voice was that of Allama Iqbal, who said: 'The liberty that you speak of may be acceptable to the Hindus but it cannot be so for the Muslims. The meaning of liberty in the Islamic context is different.' The Muslim campaigners immediately objected to his opposition, because it had been said that Islamic freedom is different, religious leaders came forward to refute Iqbal, spreading the propaganda that his voice was a fabrication of the British and a conspiracy to halt the freedom struggle. Iqbal however defied them outright. He said: 'As long as the struggle concerns breaking free of British rule, Muslims will stand by the Hindus. However as far as the Hindus are concerned the struggle ends with the removal of the British. For the Muslims it is only one step towards achieving their goal.' Iqbal then went into further detail in justifying his point of view to the Muslim leaders:

> 'As Muslims it is our duty to abolish our slavery under the British, but it is not enough for us simply to be free. Our objection in fact is to preserve Islam and to make the Muslim brotherhood strong. Hence Muslims cannot support a movement which in the long term will merely replace the British with another similar government. What is the point of removing one falsehood only to replace it with another? We require that if not all of India then at least a significant part of it must become governed under Islam. But if the result of Indian freedom is like the one that we have now under the British – i.e. a *kufr* (false) system – or one that is even worse, then it cannot be acceptable to the Muslims. I consider writing, or giving speeches, or spending money, or being kicked and beaten, or going to jail, or being shot for such a cause *haram*. Totally *haram*.'

In response to Iqbal it was said that once the British left, a democratic system – widely acclaimed as the best type of system – would be put in place, as it was in accordance with Islam. It was said that Iqbal was clearly adverse to progress and his objections were based upon his own prejudices.

Iqbal's response to this came in verse:

The so-called Democracy of the West is nothing but the old musical instrument,

Whose notes are only capable of producing tunes of the Kaiser.

The Demon of Tyranny is dancing, wearing the costume of Democracy,

And you are mistaking for the fair Maiden of Freedom.

He proclaimed: 'As to calling it Islamic, listen!

Be it grandeur of royalty or a show of democracy,

If religion is removed from politics, what remains is the Regime of Genghis

'Therefore from the Islamic point of view the democratic system is as deplorable as monarchy. We cannot claim to be free under democracy. We will end up fighting against the *Sawarajia* in the same way as it is fighting against the British now.'

Later when Quaid-e-Azam began to take up leadership of the people, he continuously repeated Iqbal's argument. He declared in a speech:

'We are two nations: one Hindu and the other Muslim. Not only do our religions differ, but also our cultures. Our (Muslim) religion gives us a code of law which covers every aspect of our lives. We wish to live in accordance with this code of law. This is why Muslims demand a country in which they can develop their culture and traditions and have the Islamic laws implemented.' (*Speeches*, *Muhammad Ali Jinnah*, *Vol 2*, P.333 & P.346)

It was because of this difference in the definition of freedom that the Muslims stood against both the British and the Hindus. The ensuing struggle continued until the Muslims obtained their separate state – i.e. Pakistan.

Their freedom was thus attained, but immediately thereafter the world witnessed a bizarre twist in the tale: Pakistan implemented the Western system of democracy, which Iqbal had called a conspiracy against Islam. Iqbal had made two points in this regard:

Firstly he said that democracy was monarchy in disguise. In this system humanity would never achieve freedom. Secondly he said that democracy is contradictory to Islam. In a democratic system Muslims could never achieve the same freedom that they would in Islam.

Now we will examine whether or not Pakistan has indeed achieved its freedom (given that it has become a democratic state), and also where Western scholars of today stand with regards to the concept of democracy.

Fundamental principles of the democratic system

1) The power belongs to the people and no one has control over it. The public has absolute power. Hence democracy means 'the people's government'.

2) In a democratic society the people rule themselves. There is no divide between the rulers and the ruled; the difference is eliminated.

3) The power of the people is enforced through their representatives.

4) These representatives pass legislations by vote, and the majority's vote is the final word on a given matter. No one from the general public can appeal against their decision, but the representatives have the authority to do so amongst themselves if they desire.

5) These representatives divide into two groups (i.e. the majority and the minority). The party in majority is in power. The minority party aims to create circumstances (such as slander) under which the majority will fall and become the minority. This is a continuous battle for power.

6) Whichever party is in the majority can do what it likes in the duration of its term, and the public (who selected it in the first place) can do nothing to remove it. The only way to remove it is to not vote for it in the next election, thereby reducing it to the status of a minority.

The thinkers of the West have observed democracy in practice and have come to the conclusion that its hypotheses have proven to be utterly false. Before we look into their conclusion in more detail however, we need to look at the circumstances which led to the democracy experiment in the first place.

Europe's revolution

The people of Europe were at one time caught between two forces: monarchy and the church's theocracy. The notion of theocracy was put forward by St Paul, who said that the right to govern people belongs only to God; but God entrusted the church with this right in His place. Hence they could do whatever they liked in His name. When the church collaborated with the Roman monarchy in mutual cooperation, then 'God's sovereignty' was suddenly diverted to kings. However the ultimate control remained with the church. Luther's movement advocated free interpretation of the Bible, their view being that the people had the right to try and understand the Bible for themselves. Thus Luther broke the church's stronghold, but because the Bible had no codes of law for running a government, the issue of establishing a government remained unresolved, and the control of power stayed with the tyrants. In France, this reached a crisis point and set the scene for the French Revolution, which subsequently paved the way for Rousseau's new model for a government. Rousseau said that neither did kings nor God's representatives have the right to govern the people. The right of power belongs only to the people, he argued. Thus he laid the foundations for a preliminary form of democracy, although the ancient Greeks had also had similar notions centuries earlier. The people who had previously been oppressed under the forces of monarchy and theocracy welcomed democracy with open arms, considering it to be a salvation.

It can be seen from the above that in fact democracy came about as an adverse reaction to a terrible situation. Democracy hadn't even been put into practice at an

experimental level – and thus it was not a case of acceptance after a successful trial run. It was more a case of theoretical democracy being seen as the only alternative to the well-tried and tested monarchy and theocracy. Now that democracy has been tested, what have the thinkers of the West concluded?

Professor A. C. Ewing of Cambridge University has discussed democracy in his book *The Individual, the State and World Government.* He has written:

> 'Had Rousseau written now, and not, as he did, prior to any experience of democracy in the modern world, he could not have been so optimistic.' (P.116).

To summarise the conclusions regarding democracy:

1) The basic premise of this system was that the people were the source of the authority (therefore there is no divide between the rulers and the ruled; the difference is eliminated). The French thinker Rene Guenon wrote in his book *The Crisis of the Modern World:*

> 'If the word 'democracy' is defined as the government of the people by themselves, it expresses an absolute impossibility and cannot even have a mere de facto existence in our time any more than in any other … The great ability of those who are in control in the modern world lies in making the people believe that they are governing themselves.' (Quoted by A.C. Ewing, in *The Individual, The State and World Government*, P.106-109).

2) Alan Gewirth, Professor of Philosophy at the University of Chicago, reveals the stark facts of democracy in the following words:

> 'The point of the groupist emphasis of this approach is in part that, so far as socio-political phenomena are concerned, "the public" or "the community" is but a fiction; all that really exists is conflicting pressure groups. On this view the democratic process becomes one of rhetorical manipulation: alleged considerations of truth, goodness, or beauty are but so many group weapons that must make their way in the political battleground or marketplace.' (Alan Gewirth, *Social Justice*, P.161)

3) The second hypothesis relating to democracy is that of *consent* – i.e. that a government comes into power by public nomination and thus they are obligated to obey that government. As the government takes power by consent, there is no tyranny within the Democratic system. However this doesn't happen in practice, as Professor Gerwith points out:

'One is obligated to obey that government to which the majority has consented through election. But, strictly speaking, such consent justifies only the majority's obligation to obey. The minority which voted against the government or

those who did not vote at all – on what does their political obligation rest?' (Alan Gewirth, *Social Justice*, P.136)

4) Bertrand de Jouvenel writes:

'The least reflection makes it clear that, once the principle of the unchecked and unbounded sovereignty of a human will is admitted, the resulting regime is in substance the same, to whatever person, real or fictive, this sovereign will is attributed. The two systems thought to be the most opposed, that which attributes to the king an unlimited and arbitrary sovereignty and that which attributes to the people precisely the same thing, are constructed on the same intellectual model; they confer the same despotic right on the effective wielder of power, who is seldom the king and can never, by the nature of things, be the people.' (Bertrand de Jouvenel, *Sovereignty, An inquiry into the political good,* P.199)

Bertrand de Jouvenel's words above echo the sentiment of those of Iqbal from many years earlier:

The so-called Democracy of the West is nothing but the old musical instrument,

Whose notes are only capable of producing tunes of the Kaiser.

Anyone who learns the wisdom of the Quran can see the state of worldly affairs for what they really are. It is of little surprise then, that Iqbal's own vision was ahead of his time as well, and this is apparent from his writing:

A calamity which is as yet hidden behind heavens' curtain:

Its reflection can be seen in the mirror of my understanding.

Bertrand de Jouvenel realised that no matter what the name of the system, as long as the right of power is being transferred from the people to any person (or group), the result is always dictatorship and tyranny. From this a new question has arisen: if human beings are incapable of governing themselves, then to whom does the absolute authority belong? This question arose after years of analysing the problem. It is important that we pay close attention to it.

The meaning of social justice

These thinkers state that the purpose of establishing a successful government is not merely to establish order; it has a higher purpose, which is to establish justice. William K Frankena, Professor of Philosophy at Chicago University, writes of justice:

'As is stated in an ancient formula, a society is just if it renders to its various members what is due to them. … The laws of the state, however, may be themselves

unjust, and if so, it follows that social justice cannot consist wholly in their observance.' (William K. Frankena, *Social Justice*, P.3)

5) How then do we decide what differentiates a just government from an unjust one? In answer to this question, Professor Frankena quotes C.I Lewis:

> 'Much of this applies to what C.I. Lewis calls "the fundamental dictum of justice" or "the Law of Moral Equality", which holds that "no rule of action is right except for one which is right in all instances, and therefore right for everyone." It insists, correctly, that the rules of a just society must be universalizable …' (*Social Justice*, P.9)

6) The term 'universalizable' implies that it is right at a worldwide and eternal scale. Professor Frankena clearly had this in mind when he quoted Tennyson's verse:

> *The good, the true, the pure, the just –*
>
> *Take the charm "Forever" from them and they crumble into dust.*
>
> (*Social Justice*, P.29)

Emil Brunner had the following to say with regards to justice:

> 'Whoever says with serious intent, "That is Just" or "That is unjust" has … appealed to a standard which transcends all human laws, contracts, customs and usages, a standard by which all these human standards are measured. Either this absolute, divine justice exists or else justice is merely another word for something which suits some but not others. … Either the word *justice* refers to the primal ordinance of God, and has the ring of holiness and absolute validity, or it is a tinkling cymbal and sounding brass.' (Frankena quoting Emil Brunner, *Social Justice*, P.28)

Eternal and inviolable laws

7) A well known scholar of Oxford and Cambridge, Ernest Barker, wrote a book titled *Principles of Social and Political Theory.* In it he wrote:

'Here we are faced by the question whether there does not exist, side by side with the positive law which contains and expresses actual validities … a law which we may call 'natural', because it corresponds 'to the nature of things' ... a law founded on what is right in itself, on what is just everywhere and at all times, on what is valuable whether or not it be valid. The question is as old as the *Antigone* of Sophocles; and Aristotle, in a passage of the Rhetoric, already supplied an answer. Distinguishing between 'particular law', which is 'the law defined and declared by each community for its own members', and the 'universal law' of all mankind, he notes that the latter is 'the law of nature; for there really exists, as all of us in some measure divine, a natural form of the just and unjust which is common to all men,

even when there is no community or contract to bind them to one another.' He cites the lines of Sophocles:

> *Not of today or yesterday its force:*
>
> *It springs eternal: no man knows its birth.*'

(Ernest Barker, *Principles of Social and Political Theory*, P.98)

Thereafter Barker quoted Blackstone:

> 'Blackstone himself, in a passage of the introduction to his *Commentaries* in which he is following, and even copying, a contemporary Swiss theorist of the school of natural law, can lay it down that 'the law of nature … is of course superior in obligation to any other … no human laws are of validity if contrary to this'. (P.100)

The American Professor Edward Corwin who is regarded as one of the foremost authorities on the American Constitution and its history, wrote a small but profound book titled *The Higher Law*. In it he came to the conclusion that a society must be founded upon values and principles that are not manmade and are applicable at all times. He wrote:

> 'The attribution of supremacy to the Constitution on the ground solely of it rootage in popular will represents, however, a comparatively late outgrowth of American constitutional theory. Earlier the supremacy accorded to constitutions was ascribed less to their putative source than to their supposed content, to their embodiment of an essential and unchanging justice. The theory of law thus invoked stands in direct contrast to the one just reviewed. There are, it is predicated, certain principles of right and justice which are entitled to prevail of their own intrinsic excellence, altogether regardless of the attitude of those who wield the physical resources of the community. Such principles were made by no human hands; indeed, if they did not antedate deity itself, they still so express its nature as to bind and control it. They are external to all Will as such and interpenetrate all Reason as such. They are eternal and immutable.' (Edward Corwin, *The Higher Law*, P.4)

Thereafter Professor Corwin quoted the famous lawyer and philosopher Cicero:

'True law is right reason, harmonious with nature, diffused among all, constant, eternal; a law which calls to duty by its commands and restrains from evil by its prohibitions … It is a sacred obligation not to attempt to legislate in contradiction to this law; nor may it be derogated from nor abrogated. Indeed by neither the senate nor people can we be released from this law; nor does it require any but ourself to be its expositor or interpreter. Nor is it one law at Rome and another at

Athens; one now and another at a late time; but one eternal and unchangeable law binding all nations through all time...' (P.10)

After this he quotes a few unforgettable words, again from Cicero:

> '(True law) is a rule of distinction between right and wrong according to nature (and) any other sort of law not only ought not to be regarded as law, it ought not to be called law.' (P.12)

Not only should it not be called law, but as Barker says, it should not be obeyed either. In his words:

> 'My loyalty to the state is controlled by the values for which it stands; and if the state should be unfaithful to them I may be bound by these controlling values to turn my loyalty into disloyalty, and to change a happy obedience into reluctant resistance.' (Ernest Barker, *Principles of Social and Political Theory*, P.165)

Further on he wrote:

> 'This plea, in effect, is a plea that political obligation is conditional and not absolute; due under certain conditions, when it does not clash with a higher demand, but not due under all.' (P.220)

By now we have seen how disillusioned the Western scholars have become by democracy, and what type of system they would like to see implemented in its place; one with eternal and universal laws, reaching far above and beyond the limits of human intellect. However to date they have not found one that meets their demands.

In this regard, Barker laments:

> 'The difficulty of such an answer was that there was no certain and known body of natural law; and even if there had been, there was no established system of courts to give it recognition and enforcement.' (P.100)

The problem facing the Western thinkers

Sadly, today's people are in precisely the same position that they were in when they first broke free from monarchy and theocracy; that is, they see democracy as the only viable alternative since there is nothing better. They were deluded by the mirage of what they thought was freedom; but now, disillusioned by the reality, they are at a loss as to how to find true freedom. Nevertheless they have continued to search, and in recent years they have started to envisage a few ideas of what the secret of a constitution for freedom might be. This includes that its laws are applicable for all time, are beyond the barriers of time and space and are thus universal. They have also reached the conclusion that such a constitution cannot be formed by human beings. This is because humans lack the intellect required to

complete such a task. Hence the source of the constitution needs to be something of higher intelligence. So far so good, but modern thinkers tend to avoid terms like 'God' and Revelation in this regard. The reason for this is very simple; they fear that this will give theocracy an opportunity to reassert its position of authority. The priests will claim that as representatives of God they are perfectly capable of providing *Divine* law. Modern thinkers know that if this occurs, they will return society to the very tyranny which they wanted to get away from when they opted for democracy. It is also because of this fear that they make use of vague alternative terms such as 'laws of nature' and 'human nature'. The other problem is that they don't know where to find the higher laws they seek. Iqbal saw their anguish and he wrote:

Love having disappeared, intellect bites him like a snake.
He has failed to subjugate the intellect to the dictates of vision.

He further wrote:

One who has captured the sun's rays could not bring the light of dawn into the dark night of life.

The state of the Muslims

We have reviewed the state of the West, but the state of the Muslim world is far worse. Centuries of slavery and oppression have caused a cessation of free intellect. This is the reason that subjugation is a curse of the worst kind. In Iqbal's words, 'they pledge their bodies and their souls to another'. Even if the slave manages to break free, his life remains in his master's possession. The slave's whole perception is skewed, as it has been shaped by his master. He sees through the master's eyes, hears through his ears, and thinks with his mind. The slave considers every tenet and aspect of the master's system to be sacred and thus follows it with a misplaced sense of loyalty or pride. This manifests itself in the form of religious devoutness and/or patriotism. In the end the slave ends up much like a young puppy with no survival instinct, happy even to get a bone thrown his way.

When Pakistan was first established as a free nation, and the time came to form a constitution, we adopted the Western democratic system as though it were divinely inspired, even though at the time democracy was proving to be a failure in the Western world. As mentioned previously, the Western thinkers have been searching high and low for a viable alternative to democracy ever since they have realised that it is practically unfeasible in the long term.

In Pakistan's early days democracy was purely a political subject. However when the priests wished to come into power, they utilised their best means of getting what they wanted – their devout religious followers. With a large number of supporters they set up a movement for the 'restoration of democracy'. Whereas in the secular world, modern thinkers had already forsaken democracy as a failure, the priests in Pakistan took the same system and declared it as being 'absolutely Islamic'. Hence in the aftermath of obtaining our country, rather than achieving the freedom we desired, we have become the camp followers of already doomed nations.

(Continue)